

مطالعهء ادب (حصہء اوّل)

برائے زبانِ دوم اُردو
بی۔ اے۔ بی۔ ایس سی۔ بی۔ کام (سال اول)

مرتبہ

شعبہء اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

ناشر

تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈمی، حیدرآباد

مطالعہ ادب

(حصہ اول)

برائے زبانِ دوم اُردو

بی۔ اے، بی۔ ایس سی، بی۔ کام (سالِ اول)

مرتبہ

شعبہ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

ناشر

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈمی، حیدرآباد

© جملہ حقوق بحق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈمی محفوظ ہیں

زیر سرپرستی

پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور ڈائریکٹر سکرٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈمی

چوتھا ایڈیشن	:	اکتوبر 2017
تعداد	:	1000 (ایک ہزار)
قیمت	:	50/- روپے
طباعت	:	طہ پرنٹ سسٹمز، لکڑی کاپل، حیدرآباد۔
کمپوزنگ	:	محمد منہاج الدین 9885683162
نظر ثانی و تصحیح	:	محمد ارشد مبین زبیری
ناشر	:	تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈمی حج ہاؤز، چوتھی منزل، نامپلی، حیدرآباد فون : 040-23237810

ملنے کے پتے

- ☆ دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈمی، حج ہاؤز، چوتھی منزل، نامپلی، حیدرآباد۔
- ☆ اُردو مسکن روبرو چومحلہ پیالیس، خلوت، حیدرآباد۔

پیش لفظ

بی اے، بی ایس سی، بی کام سالِ اوّل کے طالب علموں کو اُردو زبان دوم کی حیثیت سے تدریس کے مقاصد کے حصول کے لیے ”مطالعہ ادب“ (حصہ اوّل) مرتب کی گئی ہے جس میں شاعری اور نثر کی مختلف اصناف سے طالب علموں کو روشناس کروانے کے لیے اہم متن کے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ قدیم و جدید شعراء اور نثر نگاروں کی تخلیقات سے مناسب انتخاب کے ذریعہ طلباء کے ذوق کی آبیاری کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ شاعری میں غزل، نظم اور نثر میں حکایات، ڈراما، سفرنامہ، سوانح، انشائیہ، افسانہ اور خاکہ اصناف کو شامل کیا گیا ہے۔ ادب پاروں کے انتخاب میں طالب علموں کے معیار اور ان کے ذوق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ ”مطالعہ ادب“ اُردو زبان دوم کی نصابی کتاب طالب علموں کے لیے دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

اس نصاب کی تیاری میں نصابی کمیٹی کے ارکان اور شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کا مشورہ اور تعاون شامل ہے۔

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈمی نے ”مطالعہ ادب“ (حصہ اوّل) کے چوتھے ایڈیشن کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ میں پروفیسر ایس۔ اے شکور ڈائریکٹر سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈمی کی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کیونکہ اس ادارہ کے مالی تعاون کی وجہ سے اس کتاب کی اشاعت کا موقع فراہم ہوا۔

پروفیسر فاطمہ بیگم

حیدرآباد

سابق صدر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ

اکتوبر 2017ء

فہرست

پیش لفظ

حصہ غزل:

- 7 (۱) محمد قلی قطب شاہ:
- (۱) سنو عاقلاں سب کہ دنیا ہے فانی
(ب) مری سانولی من کی پیاری دیسے
- 10 (۲) ولی دکنی:
- (۱) پی کے ہوتے نہ کرتوں مہ کی ثنا
(ب) بجن کے باج عالم میں دگر نیں
- 13 (۳) سراج:
- (۱) مچلوں یکدم قرار نیں ہرگز
(ب) جو تیرے غم کی تمنا نہ کیا
- 16 (۴) میر تقی میر:
- (۱) کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیس نہیں
(ب) ہم سے نک آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
- 19 (۵) آتش:
- (۱) سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
(ب) خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
- 22 (۶) مرزا اسد اللہ خاں غالب:
- (۱) کوئی دن گر زندگانی اور ہے
(ب) کسی کو دیے کے دل کوئی نواسخِ فغاں کیوں ہو؟
- 25 (۷) الطاف حسین حالی:
- (۱) مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب
(ب) دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
- 29 (۸) مخدوم:
- (۱) آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
(ب) زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگ گل کا بیاں دوستو

حصہ نظم:

33	توحید	(۱) نظیر اکبر آبادی
37	مستقبل	(۲) اکبر الہ آبادی
40	بارش	(۳) ظفر علی خاں
42	فنون لطیفہ	(۴) شیخ محمد اقبال
44	پریت کا گیت	(۵) حفیظ جالندھری
49	اے شریف انسانو!	(۶) ساحر
52	اب کے برس	(۷) شاذ تمکنت

حصہ نثر:

55	چند منتخب حکایات	منظہر علی خاں ولا	(۱) حکایات
60	تلاش	انتیاز علی تاج و بیگم قدسیہ زیدی	(۲) ڈراما
72	ہندوستان جنت نشاں	صالحہ عابد حسین	(۳) سفر نامہ
86	مرزا غالب کے اخلاق و عادات	الطاف حسین حالی	(۴) سوانح
92	پڑیے گر بیمار	مشتاق احمد یوسفی	(۵) انشائیہ
107	یہ غازی یہ ترے پُر اسرار بندے	قرۃ العین حیدر	(۶) افسانہ
131	سلیمان اریب	مجتبیٰ حسین	(۷) خاکہ



محمد قلی قطب شاہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم قطب شاہ کا تیسرا فرزند اور سلطنت گولکنڈہ کا پانچواں بادشاہ تھا۔ وہ اپریل ۱۵۶۵ء کو جمعہ کے دن گولکنڈہ میں پیدا ہوا۔ پندرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ قریب اکتیس (۳۱) سال حکومت کی۔ ۱۶۱۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کا دیوان اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ نے مرتب کیا۔ محمد قلی ایک پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کا کلیات قریب پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جو چار سو سال پہلے کی سماجی دستاویز ہے۔ اس نے تقریباً تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن زیادہ توجہ صنف غزل پر کی۔

محمد قلی کے کلام میں تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اسلوب بیان میں سادگی اور روانی ہے۔ اس کے پاس موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ عشق و محبت کی وارداتوں کے ساتھ سماجی مصروفیات، کھیل کود، موسم غرض زندگی سے تعلق رکھنے والے بے شمار موضوعات اس کے پاس ملتے ہیں۔ جن کا بیان اس نے سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ کیا ہے۔



غزل (۱)

سنو عاقلاں سب کہ دنیا ہے فانی
جو کوئی بوجھیا اُس ہے صاحب قرانی

دنیا رنگ سوں جن بہوت دل نہ باندے
شہاں میں سُہاتا اُسے سلطانی

وہی مرد ہے جے دنیا میانے دین کا
کرے کام سا جے او سے کامرانی

دیو و جگ کوں بہوجن او بخشش کر و جم
کہ جھمکے گا اُس نور تھے تم پشانی

طمع کوں پیا یاد پانی سوں دھو کر
اپس دل میں تھے ہو بچن کن کہ دھیانی

نبی ہور علی سوں قطب کی ہے پیرت
سدا تو ہیں پایا ہے تختِ شہانی

☆☆☆

غزل (۲)

مری سانولی من کی پیاری دیسے
کہ رنگ روپ میں کونلی ناری دیسے

سہے سب سہیلیاں میں بالی عجب
سرو قد ناری اوتاری دیسے

سکیاں میں ڈولے نیہہ بازی سوں جب
او مکھ جوت تھے چند کی خواری دیسے

توں سب میں اتم تاری تج سم نہیں
کوئل تیری بولاں تھے ہاری دیسے

تیری چال نیکی سبھی من کوں بھائے
سکیاں میں توں جوں پھل بھاری دیسے

بہوت رنگ سوں اپ رنگیاں سکیاں
ولے کاں ترے رنگ کی ناری دیسے

نبی صدقے قطبا پیاری سدا
سہیلیاں میں زیبا تماری دیسے



ولی دکنی

ولی محمد نام، ولی تخلص۔ قدیم اُردو کے اکثر و بیشتر شعرا کی طرح ابتدائی حالاتِ زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اورنگ آباد میں ۱۶۳۸ء یا ۱۶۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن وہیں گزارا، نوجوانی کے زمانے میں گجرات کا سفر کیا۔ ولی کو حصول علم کی لگن تھی۔ ان کی مذہبی، علمی اور ادبی معلومات بہت وسیع تھیں۔ ان کے کلیات میں تقریباً تمام مروجہ اصنافِ سخن ملتی ہیں۔ چند قدیم اصناف (جن کا چلن اب متروک ہو گیا ہے) بھی ولی کے کلیات میں پائی جاتی ہیں جیسے ثلاثی، چاردرچار، بازگشت وغیرہ۔

ولی کو سیر و سیاحت کا شوق تھا اور ان کے سفرِ دہلی کا درخشاں پہلو شمالی ہند میں اُردو شاعری کی مقبولیت قرار دیا جاتا ہے۔

ولی کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیت اظہارِ بیان کی سادگی اور حقیقت نگاری ہے۔ ولی کی پرورش صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔ وہ خود صوفی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تصوف کی بڑی اہمیت ہے۔ تصوف کے نکات کے بیان میں انہوں نے بلند تخیل سے کام لیا ہے۔ عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی ہر دو کا بیان فنِ کاری کے ساتھ کیا ہے۔ سادگی، روانی، رنگینی ان کی غزلوں کا وصف ہے۔ تشبیہات، استعارات اور تراکیب میں جدت و معنی آفرینی پائی جاتی ہے۔ ولی کے پاس اخلاقی مضامین بھی ملتے ہیں۔ ولی کا انتقال ۱۷۰۰ء میں ہوا۔



غزل (۱)

پی کے ہوتے نہ کرتوں مہ کی ثنا
معتبر نہیں ہے حسن دور نما

باعث نشہ دو بالا ہے
حسن صورت کے ساتھ حسن ادا

سرخ رویاں منیں سرآمد ہے
تجھ قدم کے اثر سوں رنگ حنا

نہیں ہے گل پی کے مکھ سا عالم میں
قائل اس بات کی ہے بادِ صبا

اے ولی مجھ سخن کوں وو بوجھے
جس کوں حق نے دیا ہے فکر رسا

☆☆☆

غزل (۲)

سجن کے باج عالم میں دگر نہیں
ہمن میں ہے ولے ہم کو خبر نہیں
عجب ہمت ہے اس کی جس کوں جگ میں
بغیر از یار دو جے پر نظر نہیں
نہ پاوے صندلِ راز الہی
جسے گرمی سوں دل کی درد سر نہیں
ہوا نہیں جب تک خالی اپس سوں
گرفتاراں میں ہرگز معتبر نہیں
اپس کے مدعا کے آشیاں کوں
نہ پہنچے جب تک ہمت کے پر نہیں
نہ پوچھو درد کی بے درد سوں بات
کہے کیا بے خبر جس کوں خبر نہیں
ہوا ہوں جیوں کماں خم روز غم سوں
سینے میں تیر ہے آہ جگر نہیں
ولی اس کی حقیقت کیونکے بوجھوں
کہ جس کا بوجھنا حد بشر نہیں



سراج

سید سراج الدین نام سراج تخلص۔ ۱۵۷۱ء اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اس دور کے رواج کے مطابق تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا اور بارہ سال کی عمر میں متداولہ علوم کی تعلیم مکمل کر لی۔ اسی زمانے میں ان پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوا کرتی اور بے اختیار فارسی اشعار موزوں ہو جاتے۔ گھر سے نکل جاتے اور زیادہ تر وقت شاہ برہان الدین غریب کے مزار پر گزارتے۔

۱۶۳۵ء میں جب کہ سراج کی عمر قریب بیس سال تھی چشتیہ سلسلہ کے بزرگ شاہ عبدالرحمان سے بیعت ہوئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اردو شاعری کا آغاز کیا اور ۱۶۴۰ء کے بعد اپنے مرشد کے حکم پر شاعری ترک کر دی یعنی پانچ چھ سال کی مختصر مدت میں سراج نے اپنا ضخیم کلیات مرتب کر لیا۔

سراج نے کم و بیش تمام اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے ولی دکنی کے بعد سراج اردو غزل کے بڑے شاعر کہے جاسکتے ہیں جن کے مرتبے کو ان کا کوئی ہم عصر شاعر نہیں پہنچتا۔ سراج کے کلام کا نمایاں وصف سادگی بیان، سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی ہے۔ ان کی غزلوں میں بڑا کیف پایا جاتا ہے۔ جذبے کی شدت اور اسلوب بیان دونوں ہی منفرد ہیں۔

سراج کو صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ مزاجاً اور عملاً صوفی تھے۔ مجازی اور حقیقی دونوں طرح کے عشق کا بیان ان کے پاس ملتا ہے۔ سراج کی شاعری کا اصل محور عشق ہے جس کو وہ خلاصہ کائنات اور حاصل حیات سمجھتے ہیں۔ سراج کے کلام میں روحانی کیفیات اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ نمایاں ہیں۔



غزل (۱)

مجنوں یکدم قرار نہیں ہرگز

تجھ بغیر اختیار نہیں ہرگز

بزم عشاق میں ارے زاہد

عقل کوں اعتبار نہیں ہرگز

آشتابی کہ آج بیکل ہوں

طاقت انتظار نہیں ہرگز

سیر کر گلشنِ محبت کا

گلِ جنت کوں خار نہیں ہرگز

میکشانِ شرابِ وحدت کوں

روزِ محشرِ خمار نہیں ہرگز

کوچہ بے خودی میں مجنوں کوں

سگِ لیلیٰ سینِ عار نہیں ہرگز

ہجر کی رات میں مثالِ سراج

اشکِ غم کا شمار نہیں ہرگز



غزل (۲)

جو تیرے غم کی تمنا نہ کیا
ابدی عیش کا سودا نہ کیا
اپنی آنکھوں میں جو پنہاں نہ ہوا
اس نے کچھ عمر میں پیدا نہ کیا
حیف ہے اس کی تماشا بنی
چشمِ باطن کوں جو کئی وا نہ کیا
مدتوں لگ حرم و دیر پھرا
میں تیرے واسطے کیا کیا نہ کیا
میں کیا دل کوں گلِ داغ میں باغ
یار نے عزمِ تماشا نہ کیا
باغ میں نرگسِ بیمار طرف
گوشہ چشم میں ایما نہ کیا
جل گیا شوق کے شعلوں میں سراج
اپنی دانست میں بیجا نہ کیا

☆☆☆

میر تقی میر

میر محمد تقی نام، میر تخلص۔ ۱۷۲۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد علی متقی تھا۔ کم سنی میں ہی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد نے تعلیم و تربیت کی۔ ابھی دس برس کے بھی نہ تھے کہ والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد فکر معاش میں وطن سے دہلی کا رخ کیا۔ صمصام الدولہ تک رسائی ہوئی۔ انہوں نے میر کے لیے ایک روپیہ روزانہ مقرر کر دیا لیکن ایک ہی سال بعد صمصام الدولہ مارے گئے۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد دہلی سے اکبر آباد آئے لیکن اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ دوبارہ دہلی کا رخ کیا۔ سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس رہنے لگے۔ ادبی فکر اور ذوق کو اس سے کافی فائدہ ہوا۔ سوتیلے بھائی کا برتاؤ میر کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ اس لئے کچھ عرصہ بعد یہاں سے بھی الگ ہو گئے۔ خان آرزو کے انتقال کے وقت میر کی شاعری کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی وجہ سے دہلی پھر ایک بار تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ میر کو دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کرنا پڑا۔ نواب اودھ نے قدر و منزلت کی۔ ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

میر کا ایک فارسی دیوان اور چھ اُردو دیوان ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار مثنویاں، ایک رسالہ فیض میر، ایک تذکرہ نکات الشعرا اور سوانح ذکر میر ان کی یادگار ہیں۔ تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل گوئی میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ”خدائے سخن“ کہلائے جاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں سادگی، صفائی، نشتریت، ندرت، برجستگی پائی جاتی ہے۔ تشبیہات، استعارات اور محاوروں کا استعمال فن کاری کے ساتھ ملتا ہے۔ سوز و گداز، نرمی و حلاوت اور پرسوز لہجہ ان کی غزل کی ایسی خصوصیات ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ تقریباً تمام بڑے اور اہم شعرا نے میر کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔



غزل (۱)

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیس نہیں
اس غم کدہ میں آہ دلِ خوش کہیں نہیں

کرتا ہے دردِ دعوے دریا دلی عبث
دامن نہیں مرا تو میری آستیں نہیں

یہ درد کیونکے اس کے کروں دل نشیں کہ میں
کہتا ہوں جس طرح سے، کہے ہے نہیں نہیں

ماٹھا کیا میں صرفِ سجدِ دربتاں
مانند ماہِ نو کے مرے رب جبیں نہیں

گھر گھر ہے ملکِ عشق میں دوزخ کی تاب و تپ
بھڑکا نہ ہم کو شیخ یہ آتش وہیں نہیں

فکرِ بلند سے میں کیا آسماں اسے
ہر یک سے میرِ خوب ہو وہ یہ زمیں نہیں



غزل (۲)

ہم سے ٹک آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ
کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے
چشمک و غمزہ وہ انداز و ادا کیا کیا کچھ
دل گیا ہوش گیا صبر گیا جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ
نام ہیں خستہ و آوارہ و بدنام مرے
ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ
طرفہ صحبت ہے کہ سنتا نہیں تو میری ایک
واسطے تیرے سنا میں نے، سنا کیا کیا کچھ
حسرتِ وصل و غم ہجر وصالِ رخِ دوست
مر گیا میں پہ مرے دل میں رہا کیا کیا کچھ
تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانہ کے کہ یہاں
خاک کن کن کی ہوئی، صرف بنا کیا کیا کچھ
ایک محروم چلے میرے ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ



آتش

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص، فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ کمسنی میں والد کے انتقال کی وجہ سے آتش معقول تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ چلا آرہا تھا لیکن آتش کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف راغب تھی۔ اسی لیے انہوں نے مصحفی کی شاگردی اختیار کی اور مشق اور مقدور بھر علمی استعداد کے حصول کے ساتھ مسلم الثبوت استاد ہو گئے۔

اسی روپے ماہانہ بادشاہ لکھنؤ سے ملتے تھے لیکن فقر و فاقہ میں زندگی بسر کرنے کے عادی رہے۔ سینکڑوں شاگرد تھے جن میں رند، صبا اور وزیر وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ آتش رندانہ اور آزادانہ وضع کے آدمی تھے۔ ان کے کلام میں خاص قسم کی بے نیازی ملتی ہے۔ روزمرہ اور بول چال کا لطف کلام میں مزہ پیدا کرتا ہے۔ رنگینی اور شوخی ان کے کلام کی دلکشی دو بالا کرتی ہے۔ اختصار کے ساتھ مضمون کی ادائیگی ان کا نمایاں وصف ہے۔ لکھنؤ اسکول سے وابستہ چند کمزوریاں بھی ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔ عامیانہ خیالات، تصنع، بناوٹ، رعایت لفظی جیسی خصوصیات شاعری میں ملتی ہیں جس سے کیف اور تاثیر میں کمی واقع ہوتی نظر آتی ہے لیکن جہاں کہیں روایتی شاعری سے ہٹ کر انہوں نے سچی شاعری کی طرف توجہ کی۔ اپنا مخصوص انداز پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر بہترین شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔



غزل (۱)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا
زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشیتِ خاک
بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا
طبل و علم ہے پاس نہ اپنے ہے ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا!
آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا
بے تاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں
مہماں، سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا؟
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتشِ غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا



غزل (۲)

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ، جسے تازہ رکھے بو تیری
یقین ہے اٹکے گی جاں اپنی آکے گردن میں
سنا ہے، جاہے قریب رگِ گلو تیری
پھرے ہیں مشرق و مغرب سے تا جنوب و شمال
تلاش کی ہے صنم ہم نے چار سو تیری
شبِ فراق میں اک دم نہیں قرار آیا
خدا گواہ ہے، شاہد ہے آرزو تیری
دماغ اپنا بھی اے گل بدن! معطر ہے
صبا ہی کے نہیں حصے میں آئی بو تیری
پڑھا ہے ہم نے بھی قرآن، قسم ہے قرآن کی!
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری
یہ گردشِ فلکِ پیر سے ہوا ثابت
قوی، ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری
زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیفِ زباں
رہے گی معرکے میں آتشِ آبرو تیری



مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا اسد اللہ خاں نام تھا۔ پہلے اسد بعد میں غالب تخلص اختیار کیا۔ ۱۷۹۷ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا۔ پانچ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ چچا نصر اللہ بیگ نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ابھی نو برس ہی کے تھے کہ چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کی پنشن سے غالب کو سالانہ سات سو روپے ملتے رہے۔ گیارہ سال کی عمر میں نواب الہی بخش کی صاحبزادی سے شادی ہوئی اور دہلی منتقل ہوئے۔ دربار سے تعلق ہوا۔ پچاس روپے ماہوار اور خلعت مقرر ہوئی لیکن غدر کے بعد یہ تنخواہ بھی بند ہو گئی۔ مجبوراً رام پور چلے گئے۔ وہاں سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ وطن کی محبت نے وہاں چین سے رہنے نہ دیا۔ دہلی واپس آئے تین سال کے بعد پنشن جاری ہو گئی۔ ۱۸۶۱ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔

مرزا کو فارسی زبان سے بڑی محبت تھی اور فارسی کے بلند پایہ شعراء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ اردو میں بھی شاعری کی اور اسی شاعری نے انہیں غیر معمولی مقام و مرتبہ عطا کیا۔ ابتدائی دور کا کلام مشکل اور نامانوس طرز بیان کی وجہ سے نکتہ چینی کا نشانہ بنا۔ رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا ہوئی۔ مولوی فضل حق کی دوستی نے ایسا رنگ بدلنے پر مجبور کیا کہ اپنی نظیر آپ ہو گئے۔ مزاج میں انفرادیت تھی۔ ظرافت تھی۔ جدت اور ندرت سے کسی دور کا کلام خالی نہیں۔ خیال میں بلندی معنویت و وسعت پائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے مضمون نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں نظم کر دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ حیات و موت، جبر و اختیار، سوز و ساز، گناہ و ثواب، کائنات کے اسرار و رموز غرض بے شمار موضوعات ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ قلبی واردات، تجربات اور مشاہدات کی وہ بہترین مرقع کشی کرتے ہیں۔ ان کی شہرت و مقبولیت میں کسی زمانے میں کمی نہیں ہوئی۔



غزل (۱)

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہاے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلاے آسمانی اور ہے
ہوچکیں غالب! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

☆☆☆

غزل (۲)

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟
وہ اپنی خونہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟
سبکِ سر بن کے کیا پوچھیں کہ ”ہم سے سرگراں کیوں ہو؟“

کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اس محبت کو!
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا راز داں کیوں ہو؟
وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگِ دل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟
یہ کہہ سکتے ہو ”ہم دل میں نہیں ہیں؟“ پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو، جرم کس کا ہے!
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟
یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہولے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟
کہا تم نے کہ ”کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی؟“
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہو کہ ”ہاں، کیوں ہو؟“
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالب!
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟



الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے، نو سال کی عمر میں والد کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ بڑے بھائی اور بہن نے تعلیم و تربیت کی۔ قرآن شریف حفظ کر کے عربی و فارسی کی تعلیم شروع کی۔ حصول علم میں مشغول تھے کہ سترہ سال کی عمر میں شادی کر دی گئی۔ تحصیل علم میں ازدواجی زندگی کو حائل پایا تو پوشیدہ طور پر پانی پت سے دہلی چلے گئے۔ بیوی کے گھر والے خوش حال تھے۔ اس لیے دہلی میں مولوی نوازش علی سے عربی علوم کی تحصیل میں مشغول ہوئے۔ دیرھ سال بعد عزیزوں کے اصرار پر وطن لوٹے۔ یہاں بھی تحصیل علم میں منہمک رہے۔ ۱۸۵۷ء میں کلکٹری میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں پھر وطن لوٹنا پڑا۔ کئی سال بے کاری میں گزرے۔ ۱۸۶۲ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے انہیں اتالیق مقرر کیا۔ شیفتہ بڑے علم دوست اور خوش ذوق شاعر تھے۔ حالی کو اسی اثنا میں غالب سے بھی نیاز حاصل ہوا اور وہ ان کے عقیدت مند شاگرد بن گئے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی لاہور چلے گئے۔ جہاں انہیں گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی۔ لاہور سے پھر دلی چلے آئے اور عربک اسکول میں مدرس ہوئے۔

۱۸۷۷ء میں حکومت حیدرآباد نے قدردانی کے طور پر حالی کے نام تاحیات پچھتر روپے ماہانہ مقرر کیا جو بعد میں سو روپے کر دیا گیا۔ اس وظیفے کے سبب حالی کو اطمینان کے ساتھ علمی کام انجام دینے کا موقع مل گیا۔ اور ہمہ تن تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

قیامِ پنجاب کے زمانے میں کرنل ہال رائیڈ کی تحریک پر محمد حسین آزاد اور حالی نے مل کر ایک نئی طرز کے مشاعرے کی بنا ڈالی جس میں مصرعِ طرح کے بجائے نظم کے لیے عنوان تجویز کیا جاتا تھا۔ ان مشاعروں نے اردو نظم نگاری کو فروغ دینے میں بڑا حصہ لیا۔ حالی نے ۱۹۱۷ء میں انتقال کیا۔

حالی بہ یک وقت شاعر، مقالہ نگار، سوانح نگار اور نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ان شعرا میں ہیں جنہوں نے غزل اور نظم دونوں میں بہت بلند مقام حاصل کیا۔ انہوں نے اردو شاعری میں نظم کو رواج دینے میں بھی بڑا حصہ ادا کیا اور اپنی نظم گوئی کے ذریعہ اردو شاعری کو وسعت دی۔ اردو شاعری حالی سے پہلے بڑی حد تک حسن و عشق کے دائرے میں محدود تھی لیکن حالی نے اس میں ہر قسم کے موضوعات داخل کیے۔ ان کا انداز بیان صاف و سلیس ہے۔ سیدھے سادھے الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا کلام متاثر کن ہے۔



غزل (۱)

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
وہ دن گئے کہ حوصلہٴ ضبطِ راز تھا!
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب
جس دل کو قید ہستی دنیا سے ننگ تھا
وہ دل اسیرِ حلقہٴ زلفِ بتاں ہے اب
آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب
لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمن دیں مہرباں ہے اب
اک جُرعہٴ شراب نے سب کچھ بھلادیا
ہم ہیں اور آستانہٴ پیرِ مغاں ہے اب
ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز
ہاں جذبِ دل مدد کہ دم امتحاں ہے اب
ہے دل غم جہاں سے سبکدوش ان دنوں
سر پڑتا، سوجھتا کوئی بارِ گراں ہے اب
حالی تم اور ملازمت پیرِ مے فروش
وہ علمِ دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

☆☆☆

غزل (۲)

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سیکڑوں اس میں
ہو نہ بیٹا تو فرق پھر کیا ہے
چشمِ انسان و چشمِ نرگس میں
بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں
دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اس میں
جس سے نفرت ہے اہل نعمت کو
وہی نعمت ہے چشمِ مفلس میں
ہو فرشتہ بھی تو نہیں انسان
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں
جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں
آج کل چرخِ صلح جو ہے بہت
دیکھئے ہو بگاڑ کس کس میں
کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

☆☆☆

مخدوم

مخدوم محی الدین نام، مخدوم تخلص میدک کے ایک گاؤں اندول میں 4 فروری 1908ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام غوث محی الدین تھا۔ کم سنی میں والد کے انتقال کی وجہ چچا مولوی رشید الدین صاحب کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کی۔ چچا کے تبادلوں کی وجہ مختلف مقامات پر زیر تعلیم رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ 1936ء میں ایم اے اُردو کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ملازمت کی ابتداء کلرکی سے ہوئی۔ بعد میں سٹی کالج حیدرآباد میں اُردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔

مخدوم دوران تعلیم کمیونسٹ نظریات سے متاثر ہوئے۔ مزدوروں کی فلاح اور بہبود کے لیے کام کیا۔ اس میں بڑھتی مصروفیت نے ملازمت سے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا۔ دورانِ تعلیم مخدوم نے شاعری شروع کی اور بطور شاعر جلد ہی اپنی منفرد شناخت بنالی۔ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے اسٹیج کیے۔ ایم اے کے لیے ڈرامہ پر تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا لیکن بطور شاعر ان کا مرتبہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ نظم اور غزل دونوں میں ان کی نگارشات ملتی ہیں۔ سرخ سویرا اور گل تر دو شعری مجموعے ہیں۔ بساطِ رقص کے نام سے ایک اور شعری مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جس میں پہلے دو مجموعوں کے کلام کو شامل کیا گیا ہے۔ مخدوم کا انتقال 25 اگست 1969ء کو ہوا۔

مخدوم کی شاعری میں سلاست، روانی اور بہاؤ کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ ذاتی تجربات، مشاہدات اور جذبات کا اظہار، فن کاری اور اثر آفرینی کے ساتھ ملتا ہے۔ آہنگ اور انداز منفرد اور پُر اثر ہے۔



غزل (۱)

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

بانسری کی سریلی سنہری صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر



غزل (۲)

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگِ گل کا بیاں دوستو
گاہ روتی ہوئی گاہ ہنستی ہوئی، میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو
ہے یہ اُس کے جمالِ نظر کا اثر، زندگی زندگی ہے، سفر ہے سفر
سایہ شاخِ گل، شاخِ گل بن گیا۔ بن گیا ابر، ابر رواں دوستو
زندگی اک مہکتی ہوئی رات ہے، لڑکھڑاتی نگاہوں کی سوغات ہے
پنکھڑی کی زبان، پھول کی داستان، اس کے ہونٹوں کی پرچھائیاں دوستو
کیسے طے ہوگی یہ منزلِ شامِ غم، کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم
اک ہتیلی میں دل، اک ہتیلی میں جاں، اب کہاں کا یہ سودو زیاں دوستو
دوستو ایک دو جام کی بات ہے، دوستو ایک دو گام کی بات ہے
ہاں اُسی کے درو بام کی بات ہے بڑھ نہ جائیں کہیں دوریاں دوستو
سن رہا ہوں حوادث کی آواز کو، پارہا ہوں زمانے کے ہر راز کو
دوستو اٹھ رہا ہے دلوں سے دھواں، آنکھ لینے لگی ہچکیاں دوستو





نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی کا پورا نام سید ولی محمد اور تخلص نظیر تھا۔ ان کا تعلق خاندان قریش سے تھا۔ والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔ نظیر دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اختلاف رائے ہے۔ مختلف بیانات کی روشنی میں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی ۱۷۳۵ء سے لے کر ۱۷۴۱ء کے کسی درمیانی سال میں پیدا ہوئے۔ نظیر ابھی کم سن ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور جب باشعور ہوئے تو ترک وطن پر مجبور ہو گئے کیوں کہ دہلی نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ اوروں کی طرح دہلی کی مصیبتوں نے انہیں بھی چین سے رہنے نہ دیا۔ نظیر گوشہ عافیت کی تلاش میں نانی اور ماں کو لے کر اپنے ننھیال اکبر آباد روانہ ہوئے اور اپنی تمام تر زندگی یہیں بسر کر دی۔ اسی لیے اکبر آبادی کہلائے۔ ان کے لیے یہاں کا ماحول نہایت سازگار ہوا۔ نظیر کی شاعری کی ابتداء اور شہرت دونوں اکبر آباد کی مرہون منت ہے۔ یہ فطری شاعر تھے۔ اصلاح سخن کسی سے بھی لینا گوارا نہ کی۔

کلیات نظیر میں حمد، نعت، منقبت، غزل، مخمس، شہر آشوب سب کچھ شامل ہیں۔ لیکن ان کا مرتبہ بہ حیثیت نظم گو اردو شاعری میں منفرد ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں نظم نگاری کا آغاز نظیر اکبر آبادی سے ہی ہوتا ہے کیوں کہ انہوں نے ایسے دور میں نظم گوئی اختیار کی جب کہ غزل کا رواج تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری کا مواد انسان اور اس کی روزمرہ زندگی سے لیا ہے ان کی شاعری ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہے۔ نظیر کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت ہے۔ ذخیرۃ الفاظ کی کمی نہیں ہے۔ وہ ہر منظر اور ہر کیفیت کا نقشہ پیش کر جاتے ہیں۔ عوام اور مقامی الفاظ و محاوروں کو انہوں نے بڑی ہی بے تکلفی اور روانی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو پہلا عوامی شاعر یا جمہوری شاعر بھی کہا گیا ہے۔



توحید

تہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان
بے رنگ میں، یا رنگ میں، نیرنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں، ہر آہنگ میں پہچان

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

پھل پات، کہیں شاخ، کہیں پھول، کہیں بیل
آزاد کوئی سب سے، کسی کا ہے کہیں میل
کرتا ہے کوئی، ظلم کوئی لیتا ہے جھیل
ادنیٰ کوئی، اعلا کوئی، سوکھا کوئی، دتر پیل

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

گاتا ہے کوئی شوق میں، کرتا ہے کوئی حال
ہنتا ہے کوئی شاد، کسی کا ہے بُرا حال
ناچے ہے کوئی شوخ، بجاتا ہے کوئی گال
کرتا ہے کوئی ناز، دکھاتا ہے کوئی حال

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سماچار
بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی زار
مفلس کوئی نادار، تو نگر کوئی زردار
جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں سب اسرار

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

ہے کوئی دلی دوست، کوئی جان کا دشمن
مالا کوئی جپتا ہے، کوئی شوق میں سمرن
نکلے ہے جواہر کے کوئی پہن کے ابرن
جوگی کوئی بھوگی کوئی، اگی کوئی سوگن

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

سردی کہیں، گرمی کہیں، جاڑا کہیں برسات
حوریں کہیں، غلاماں کہیں پریاں کہیں جنات
سختی کہیں راحت، کہیں گردش، کہیں سکونات
تارے کہیں، سورج کہیں، بُرج اور کہیں دن رات

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

نیچے ہے جواہر کوئی زر، سیم و طلا رنگ
دیتا ہے کوئی ہاتھ سے، لیتا ہے کوئی مانگ
مارے کوئی پارے کو، بناوے کوئی مرگانگ
محتاج کوئی قوت کا، رکھتا ہے کوئی دانگ

ٹھہرا ہے کوئی چور، لگاتا ہے کوئی تھانگ
گھنٹہ ہے کہیں جھانجھ، کہیں سنکھ، کہیں مانگ
ملتا ہے کوئی پوست کو، چھانے ہے کوئی بھانگ
جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب سوانگ

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

ناری کوئی باری، کوئی خاکی، کوئی آبی
باتیں کوئی بیٹھا ہوا کرتا ہے کتابی
صوفی کوئی زاہد، کوئی بدمست شرابی
پیتا ہے کوئی کیف، کوئی مے کی گلابی
مارے ہے زٹل کوئی، کہیں جیب ہے دابی
سچا، کوئی جھوٹا ہے، کوئی رند خرابی
کالا کوئی گورا، کوئی پیلا، کوئی آبی
ہیں اُس کی ہی قدرت کے یہ سب لال گلابی

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

کیا حُسن کہیں پایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا رنگ یہ رنگوایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا عشق کہیں چھایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا نور یہ جھمکایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا دھوپ ہے، کیا سایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا مہر ہے، کیا مایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا ٹھاٹھ یہ ٹھہرایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا بھید نظیر آیا ہے! اللہ ہی اللہ!

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

☆☆☆

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین نام اکبر تخلص ۱۸۴۶ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر تفضل حسین تھا۔ اس دور کے مطابق تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے درجوں میں ممتاز رہے۔ مختاری کا امتحان کامیاب کر کے نائب تحصیلدار ہو گئے۔ وکالت کا امتحان پاس کر کے منصف ہو گئے اور بطور جج خدمات انجام دیں۔

شعر و شاعری سے بچپن سے ہی دلچسپی رہی۔ خواجہ آتش کے شاگرد وحید الدین وحید کے شاگرد تھے۔ ابتدائی دور کے کلام میں مقررہ مضامین کو سیدھے سادھے انداز میں نظم کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ بعد میں قدیم طرز فکر میں شوخی و ظرافت کا عنصر غالب آتا گیا۔ ملک اور قوم کی حالت دیکھ کر ان کا دل بھر آیا۔ انہوں نے طنز آمیز باتیں نظم کر کے دلوں کو اصلاح پر مائل کرنے کی کوشش کی۔ اکبر مغرب کی کورانہ تقلید کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اہل مشرق کو وہ اس بات کا مشورہ دیتے نظر آتے ہیں کہ وہ جوہر پیدا کرو جس سے خود کی اور ملک کی حالت میں بہتری پیدا ہو۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ان کی نصیحت ناخوشگوار نہیں معلوم ہوتی۔

انہوں نے اپنے ماحول کی ترجمانی اور سماج کی درستی اپنی شاعری کے ذریعے انجام دینے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔

ادبی نقطہ نظر سے ان کے کلام کا جائزہ بتاتا ہے کہ سلاست، روانی، معنی آفرینی، موثر انداز بیاں ان کی شاعری کی عام خصوصیات رہی ہیں اور یہ انہیں تاریخ ادب کا ایک اہم حصہ بناتی ہیں۔



مستقبل

یہ موجودہ طریقے راہی ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی، اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پتچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ ناخاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل، زمزے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے معنیٰ نغمہٗ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے، اس لئے بے تال و سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زبان نا آشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاشا سے ضم ہوں گے

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفنِ افسانہ جاہ و حشم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ دکھ ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا، اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر!
بہت نزدیک ہے وہ دن، نہ تم ہو گے، نہ ہم ہوں گے



ظفر علی خاں

۱۸۷۰ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ پٹیالہ سے دسواں درجہ پاس کرنے کے بعد علی گڑھ آئے اور یہاں سے ۱۸۹۲ء میں ایف، اے کا امتحان پاس کر کے محکمہ ڈاک و تار میں نوکری کر لی مگر یہ نوکری زیادہ دن تک قائم نہ رہی چھوڑ کر پھر علی گڑھ واپس آئے اور پھر پڑھنا شروع کیا۔ بی۔ اے پاس کر کے محسن الملک کے پرائیوٹ سکریٹری ہو گئے۔

ظفر علی خاں کی گونا گوں صلاحیتیں ان کو میدان سیاست میں لے آئیں۔ اس محاذ پر انہوں نے بڑی جلدی نمایاں حیثیت حاصل کر لی کیونکہ وہ خطیب بھی تھے، ادیب بھی، شاعر بھی تھے، صحافی بھی، صاحب دماغ بھی تھے اور سپاہی بھی۔ ملکی اور قومی خدمات کے لئے اپنے کو وقف کر دیا تھا۔ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ان کو پانچ سال کی سزا ہوئی اور پھر مختلف اوقات میں سامراجی حکومت سے مقابلہ کرنے میں متعدد بار جیل جانا پڑا، جوڑا جائے تو آپ کی جملہ میعاد قید بارہ سال سے کم نہ ہوگی۔ طویل علالت کے بعد ۱۹۵۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کا قلم شعر و شاعری کی دنیا میں بھی رواں رہتا ہے، نظموں کا ایک مجموعہ بہارستان شائع ہو چکا ہے جس میں زیادہ تر سیاسی و مذہبی نظمیں ہیں۔ تشبیہ و استعارے کی جدت، بیان کی برجستگی، خیال کا واضح طور پر چند الفاظ میں ادا کرنا ایسی خوبیاں ہیں جو ظفر علی خاں کو ایک خاص طرز تحریر کا مالک بنا دیتی ہیں، زبان میں عموماً روانی ہوتی ہے، زور اور تاثیر کی بھی کمی نہیں، زبان کسی قدر عالمانہ ہے اور یہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔



بارش

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی
آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادرِ ابر سیاہ
برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ
بادل اتنے میں دُرناستہ برسانے لگے
داستانِ قلم و عماں کو دہرانے لگے
جھوم کر اٹھی گھٹا۔ برسی برس کر پھٹ گئی
گرد کی چادر زمیں کے منہ سے فوراً ہٹ گئی
بادلوں سے نورِ خورشید اس طرف چھننے لگا
سایاں قوسِ قزح کا اس طرف بننے لگا
سبزہ زاروں میں کلیلیں کرتے پھرتے تھے ہرن
تھا مہابن کا ہر اک کو ناخن اندر ختن
جنگلوں میں مست ہو کر ناچتے پھرتے تھے مور
کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور
ڈھل کے پہنچا تھا افق کے آسماں تک آفتاب
تھی شفق کی اس کے منہ پر ایک نارنجی نقاب
یہ نظر آرا مناظر تھے کچھ ایسے دل فریب
ہاتھ سے جاتا رہا دل میرے اور دل سے شکیب
عالم از خود رنگی کا مجھ پہ طاری ہو گیا
جوشِ مستی کامری ہر رگ میں ساری ہو گیا

☆☆☆

شیخ محمد اقبال

شیخ محمد اقبال نام، سرخطاب، تخلص اقبال۔ ۱۸۷۳ء سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ مکتب میں ابتدائی تعلیم کے بعد اسکول سیال کوٹ میں داخل ہوئے۔ یہاں شمس العلماء مولانا میر حسن عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ اقبال نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان وہیں سے پاس کیے۔ ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ۱۸۹۹ء میں فلسفے میں ایم اے کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور وہاں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک رہے۔ اسی دوران میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے ۱۹۰۷ء میں فلسفہ عجم کے موضوع پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

اقبال اپنی تعلیمی، علمی و عملی زندگی میں دو اساتذہ سے بے حد متاثر رہے۔ ایک تو مولانا میر حسن، دوسرے گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر تھامس آرنلڈ۔ انگلستان جانے سے پہلے اقبال اور نیٹل کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی پر وکالت کو مستقل طور پر ذریعہ معاش بنایا۔ البتہ جزوقتی استاد کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی پڑھاتے رہے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ اقبال ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے اولین نقیبوں میں سے ہیں۔ ان کی قومی اور وطنی تنظیمیں صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ ساری ہندوستانی زبانوں کی قومی شاعری کا قابل فخر سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔ اقبال پہلے پیامبر شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک منظم اور مبسوط فلسفہ حیات اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اردو شاعری میں اقبال کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے فلسفیانہ فکر کو اعلیٰ ترین شعریت سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اقبال کی فکر کی

آفاقیت اور فن کی پختہ کاری انہیں دنیا کے عظیم شعرا کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔ وہ عظمت انسان کے سب سے بڑے نقیب تھے۔

اقبال کی شاعری اور فلسفہ کا محور خودی، عشق اور عمل ہے۔ ان موضوعات کو انہوں نے جس شاعرانہ کمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ انہیں اردو شاعری میں عظمت اور احترام کے اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں بہت کم شاعروں کی رسائی ہوتی ہے۔

اردو میں اقبال کے تین مجموعہ کلام ملتے ہیں۔ بانگ درا۔ بال جبریل، ضرب کلیم۔ اس کے علاوہ ارمغانِ حجاز میں اردو اور فارسی دونوں کلام شامل ہیں۔ فارسی کلام کے مجموعوں میں اسرارِ خودی، رموز بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، مسافر، پس چہ آید باید کرد، اے اقوامِ مشرق شامل ہیں۔ اردو نثر میں اقبال کے مکاتیب بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی اور جرمن زبانوں میں فلسفیانہ موضوعات پر اہم مقالے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔



فنونِ لطیفہ

اے اہل نظر! ذوقِ نظر، خوب ہے لیکن
مقصودِ ہنر، سوزِ حیاتِ ابدی ہے
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
شاعر کی نوا ہو؟ کہ معنی کا نفس ہو

جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا؟
یہ ایک نفس، یا دو نفس، مثل شرر کیا؟
اے قطرہ نیساں! وہ صدف کیا؟ وہ گہر کیا؟
جس سے چمن افسردہ ہو، وہ بادِ سحر کیا؟

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں تو میں

جو ضربِ کلیسی نہیں رکھتا، وہ ہنر کیا؟



حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری ۱۹۰۰ء میں جالندھری میں پیدا ہوئے، بہت قلیل عرصہ میں حفیظ نے اپنی شاعری کا سکہ ملک میں رواں کر دیا، شاہنامہ اسلام لکھ کر ایک خاص شہرت کے مالک ہو گئے، کلام کو قبول عام کا شرف حاصل ہو چکا ہے، فردوسی نے محمود غزنوی کے اشارے سے شاہنامہ لکھ کر ایران کے بادشاہوں کی عظمتوں کو پھر سے زندہ کرنے کی جو کامیاب کوشش کی تھی وہ سب پر ظاہر ہے، حفیظ نے اپنے مذہبی جذبات سے متاثر ہو کر اسلام کی گزشتہ عظمت و خدمات کو از سر نو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں شاعرانہ حیثیت سے بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں، بیانیہ شاعری اور وہ بھی تاریخی و روایتی واقعات کو نظم کرنا اور خشکی و نثریت سے محفوظ رکھنا آسان نہیں، فنکاری کے ساتھ ساتھ ایک خاص آن بان اس کام کے لئے درکار ہے، حفیظ قابل ستائش ہیں کہ اس مہم کو بڑی خوبی سے سر کر گئے ہیں، تمام کلام میں شعریت نمایاں ہے، اسلامی جوش جا بجا زور و فخر کی لہر بھی دوڑا دیتا ہے، جس سے کلام میں ایک عظمت و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے، واقعات دلچسپ ہو جاتے ہیں اور بیانات پُر اثر۔

شاہنامہ اسلام کے علاوہ ان کی نظموں کے اور مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، مثلاً نغمہ زار، سوز و ساز، جن میں علاوہ اور خوبیوں کے سب سے نمایاں خوبی کیفیت و روانی کی ہے، جس کے بہاؤ میں پڑھنے والا خود بہہ جاتا ہے، ان خصوصیات کو با اثر بنانے کے لئے بحروں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، جن کی خاص خوبی ترنم آفرینی ہے، فارسی کی لطافت ملک کے مقامی اثر نے ان نظموں کو ایک خاص انفرادیت عطا کر دی ہے، بیخودی و سرشاری و روانی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں جو دل و دماغ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

حفیظ کے گیت بھی بڑے موثر ہیں، چونکہ وہ بحروں کی دل کشی کا خاص لحاظ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے اثر زیادہ ہوتا ہے، نرم و شیریں الفاظ جو بلندی کی چاشنی لے کر موضوع کو سراپا نغمہ بنا دیتے ہیں، ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح، شہسوارِ کربلا، نغمے ایسی نظمیں ہیں جن کو پڑھ کر حفیظ کی نظم نگاری کی صلاحیت کا قائل ہو جانا پڑتا ہے، سیاسی، تاریخی و مذہبی اور تخیلی کارناموں میں سیرت نگاری صداقت و شعریت کو ایک جگہ اتنا کامیاب بنا دینا ہر شخص کا کام نہیں۔



پریت کا گیت

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے
دل کی دنیا کر لے روشن
پریت ہے تیری ریت پُرانی
او مورکھ او بھولے بھالے
اپنے گھر میں جوت جگالے
بھول گیا او بھارت والے

بھول گیا او بھارت والے

پریت ہے تیری ریت

بسالے

اپنے من میں پریت

(۲)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اُترا ڈیرا
چھایا چاروں کھونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہن
ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا
ظاہر داروں کی سنگت میں
کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

کوئی نہیں ہے سگی ترا
من ہے تیرا میت
بسالے
اپنے من میں پریت

(۳)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت
بھارت ماتا ہے دُکھیاری
تو ہی اُٹھالے سندر مرلی
تو جاگے تو دنیا جاگے
دُکھیارے ہیں سب نر ناری
تو ہی بن جا، شام، مراری
جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
گائیں تیرے گیت
بسالے
اپنے من میں پریت

(۴)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

نفرت اک آزار ہے پیارے دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اصلی روپ میں آجا تو ہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا من کے ہارے ہارے پیارے

من کے ہارے ہارے پیارے

من کے جیتے جیت

بسالے

اپنے من میں پریت

(۵)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے مر جائے پر میت نہ جائے
میں ڈرتا ہوں کوئی تیری جیتی بازی جیت نہ جائے
جو کرنا ہے جلدی کرلے تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

وقت نہ جائے بیت

بسالے

اپنے من میں پریت

☆☆☆

ساحر لدھیانوی

عبدالحی نام ساحر تخلص۔ ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ والد چودھری فضل احمد خوش حال اور صاحب حیثیت آدمی تھے۔ ابھی کم سن ہی تھے کہ والد اور والدہ میں کشیدگی اس حد تک بڑھی کہ علحدگی ہوگئی۔ ساحر ماں کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کی تعلیم و تربیت والدہ اور ماموں کی زیر نگرانی ہوئی۔ دیال سنگھ کالج سے بی اے کیا۔ کم عمری سے شاعری شروع کی۔ ۱۹۴۷ء تک ایک خاص شہرت کے مالک ہو گئے۔ ساحر نے اپنی ملازمت کا سلسلہ بھی ادبی مشاغل میں ڈھونڈھا۔ چنانچہ لاہور میں ادب لطیف اور سویرا ماہ ناموں میں بحیثیت مدیر کام کرتے رہے۔ دلی میں ”شاہراہ“ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ تقسیم ہند میں بڑے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ حالات نے انہیں بمبئی پہنچا دیا۔ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے فلمی گیت لکھنے میں مصروف ہوئے جو بے حد مقبول ہوئے۔

نثر میں کارل مارکس اور سامراج دو ترجمے اور نظم میں ”تلخیاں“ اور ”پرچھائیاں“ مجموعے شائع ہوئے جو بے حد مقبول اور مشہور ہیں۔

ساحر کی شاعری اپنے عہد کا مرقع ہے۔ سیاسی، سماجی حالات کی عکاسی ان کی نظموں میں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہے۔ غریبوں کا دکھ، درد، ماحول کی کشمکش، ملک کی ابتری اور سماج کی مفلسی ان کے محبوب موضوعات ہیں۔

انداز بیان کے لحاظ سے ساحر کی نظموں میں میر کا انداز مخاطب ملتا ہے۔ کبھی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں، کبھی محبوب سے اور کبھی کسی اور سے، مگر جس سے بھی مخاطب ہوتے ہیں اس کے شایان شان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ساحر کا انتقال اردو شاعری میں ایک اچھے شاعر کا نقصان ہے۔



اے شریف انسانو!

(ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی اور معاہدہ تاشقند کی سالگرہ پر نشر کی گئی)

خون اپنا ہو، یا پرایا ہو
جنگ، مشرق میں ہو، کہ مغرب میں
ہم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
کھیت اپنے جلیں، کہ غیروں کے
ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
فتح کا جشن ہو، کہ ہار کا سوگ
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
آگ اور خون آج بخشنے گی
اس لیے اے شریف انسانو!
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں

نسلِ آدم کا خون ہے آخر
امنِ عالم کا خون ہے آخر
روحِ تعمیر، زخمِ کھاتی ہے
زیستِ فاقوں سے تلملاتی ہے
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
زندگی میتوں پہ روتی ہے
جنگ کیا مسلوں کا حل دے گی؟
بھوک اور احتیاج کل دے گی
جنگ ٹلتی رہے، تو بہتر ہے
آپ اور ہم رہیں تو بہتر ہے

برتری کے ثبوت کی خاطر
گھر کی تاریکیاں مٹانے کو
جنگ کے اور بھی تو میدان ہیں
حاصلِ زندگی خرد بھی ہے
آؤ! اس تیرہ بخت دنیا میں

خون بہانا ہی کیا ضروری ہے
گھر جلانا ہی کیا ضروری ہے؟
صرف میدانِ کشت و خون ہی نہیں
حاصلِ زندگی جنوں ہی نہیں
فکر کی روشنی کو عام کریں

امن کو جن سے تقویت پہنچے ایسی جنگوں کا اہتمام کریں
جنگ، وحشت سے، بربریت سے امن، تہذیب و ارتقا کے لیے
جنگ مرگ آفریں سیاست سے امن، انسان کی بقا کے لیے
جنگ، افلاس اور غلامی سے امن، بہتر نظام کی خاطر
جنگ، بھٹکی ہوئی قیادت سے امن، بے بس عوام کی خاطر
جنگ، سرمایے کے تسلط سے امن، جمہور کی خوشی کے لیے
جنگ، جنگوں کے فلسفے کے خلاف امن، پُر امن زندگی کے لیے



شاذ تمکنت

شاذ تمکنت ۳۱ جنوری ۱۹۳۳ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد ۱۹۴۱ء میں ناپلی اسکول میں داخلہ لیا۔ انہیں ابتدا ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ۱۹۴۹ء میں پہلی نظم والدہ کی یاد میں کہی۔ اس کے بعد حیدرآباد اور ہندوستان کے کئی رسالوں میں کلام کی باقاعدہ اشاعت ہونے لگی۔ ان کے کلام کے مجموعے 'تراشیدہ' اور 'نیم خواب' قابل ذکر ہیں۔ مخدوم محی الدین کی حیات اور ادبی کارناموں پر مقالہ لکھ کر انہوں نے ۱۹۸۳ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ شاذ کی کتابوں پر مختلف اداروں اور انجمنوں نے گراں قدر ایوارڈ عطا کیے۔ ۱۸ اگست ۱۹۸۴ء کو شاذ کا انتقال ہوا۔

شاذ بھی ان شاعروں میں سے ہیں جو نظم و غزل گوئی پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ تراشیدہ ان کے مجموعہ کلام کا نام ہی نہیں بلکہ خود ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت اور وصف ہے۔ ان کے کلام میں انداز بیان کی تراش خراش ملتی ہے۔ وہ اپنے کلام کو ہر ممکن طریقے سے خوب صورت اور مناسب بناتے ہیں اور الفاظ کو نکھارتے اور سنوارتے ہیں۔ وہ سرزمین دکن کے مایہ ناز شاعروں میں سے ہیں۔



اب کے برس

کوئی دستک کوئی آواز کوئی نغمہ نو
درِ گل باز کر، اے بادِ صبا اب کے برس
چاند کو گھول دے پیمانہ شب میں اب کے
رنگ میں ڈوب دے سورج کی ضیا اب کے برس
شمع کا نور ہو پگھلے ہوئے کندن کی طرح
خاک پروانہ کو اکسیر بنا اب کے برس
ہر مہینہ پہ ہو پھولوں کے مہینہ کا گماں
ہر دن آتی رہے ساون کی گھٹا اب کے برس
سرو و وشمشاد و صنوبر کو ملے لطف خرام
شبِ نیمِ خفتہ کو دے اذنِ بقا اب کے برس
جانبِ دل سے چلے ذکرِ رہ و رسمِ جنوں
سمتِ خواہاں سے بندھے عہدِ وفا اب کے برس
نیمِ رس رہنے نہ پائے مرے صہبا ساقی
تلخیِ کام و دہن اور سوا اب کے برس
من کے گوکل میں کوئی ناز کا گھنگھر و بولے
تن کے مدھوبن میں کوئی لو کا لگا اب کے برس
کھول دے بابِ اثر رول دے کچھ لعل و گہر
ابر کی طرح اٹھے دستِ دعا اب کے برس





منظہر علی خاں ولا

ان کا اصل نام مرزا لطف علی تھا مگر مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہوئے، ان کے والد کا نام سلیمان علی خاں تھا اور و داد تخلص، فارسی کے اچھے شاعر تھے، وطن دلی تھا، مظہر علی خاں ولا فارسی، سنسکرت، ہندی کے عالم تھے، مرزا جان طیش اور مصحفی کے شاگرد تھے، خوش قسمتی سے ان کو بھی فورٹ ولیم کالج میں جگہ مل گئی، یہاں رہ کر انہوں نے بھی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا، مثلاً:

- (۱) مادھونل اور کام کنڈلا، موتی رام کبیشر کی ہندی کتاب کا ترجمہ جو ۱۸۰۲ء میں ختم ہوا۔
- (۲) ہفت گلشن۔ ناصر علی خاں کی فارسی کتاب کا ترجمہ ۱۸۰۲ء میں ختم کیا۔
- (۳) بیتال پچپیسی، بیتال نامے ایک شخص کی ۲۵ کہانیاں سنسکرت میں لکھی گئی تھیں پھر کسی نے برج بھاشا میں اس کو منتقل کیا، ولا نے برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔
- (۴) تاریخ شیر شاہی، ولا نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا، ترجمہ ۱۸۰۵ء میں ختم ہوا۔
- (۵) جہانگیر نامہ۔ تزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔ ولا کا ایک دیوان بھی اردو میں ہے مگر نایاب ہے۔ شامل نصاب حکایتیں ”ہفت گلشن“ سے لی گئی ہیں۔



حکایات

شکم اور اعضائے بدن کا مباحثہ

تیرے لیے کرتے ہیں اور تیرے واسطے یہ سب دکھ بھرتے ہیں۔ ہمیں اس سے کیا فائدہ اور تجھ سے کیا نفع؟“ آخر کو سب نے یہ ٹھہرایا۔

ہاتھ نے کہا کہ ”آج نوالہ نہ اٹھاؤں گا۔ دیکھوں تو کیونکر کھاتا ہے؟“
دہن نے کہا کہ ”میں ہرگز لقمہ حلق کے نیچے نہ اتاروں گا۔ دیکھوں کس طرح سے تو بھرتا ہے؟“

دانتوں نے کہا ”ہم روٹی نہ چبائیں گے۔ دیکھیں تو کس طور ہضم کرتا ہے؟“
غرض سب نے اسی عہد پر عمل کیا اور غذا کے پہنچانے میں مدد نہ کی۔
تب پیچارے شکم نے صبر و شکیبائی اختیار کی۔

جب یوں ہی دو تین روز گزرے تو سب اعضا سست ہو گئے۔ کسی میں کچھ سکت نہ رہی اور خشکی بدن کے پوست پر ظاہر ہوئی۔

فائدہ قصے کا یہ ہے کہ سب نوکروں کے تئیں لازم ہے کہ اپنے ولی نعمت کی ذلت کے روادار نہ ہوں اور اپنے سردار کے تئیں نظر دشمنی سے نہ دیکھیں کہ خرابی اس کی خرابی ان کی ہے۔

خر اور دہقان

کہتے ہیں ایک گدھے نے ایک روز شیر کی کھال پہنی اور اپنا نام شیر رکھا۔
غرض اسی وضع سے ہر روز جنگل میں گزرا ایک روز ایک گنوار کا اس جنگل سے گذر ہوا اور اس کے پاس آیا۔

گدھا جس طور وحشیوں کو ڈراتا تھا اسی طرح اس گنوار کو بھی ڈرانے لگا۔

دہقان نے کہا ”اے خر! تو شیر کی کھال پہن کے بیچارے وحشیوں کو ڈراتا ہے۔ لیکن میں دونوں کانوں سے اور تیرے ہاتھ پاؤں سے تجھ کو پہچان چکا ہوں۔ کیوں تو مجھ کو بازی و فریب دیتا ہے؟“

اتنا کہا اور غصے ہو کر ایک لٹھ اس کے سر پر پھرا کر مارا کہ سر اس کا پھٹ کر بھیجا نکل پڑا اور بے ہوش ہو کر زمین میں گرا۔

فائدہ قصہ کا یہ ہے کہ جو حوصلہ ہووے اتنا ہی کام کرے اور اپنی حد سے زیادہ نہ بڑھے!



دو یار

سنتے ہیں دو یار تھے کہ آپس میں کمال دوستی رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ”ایک دل ہونا خوب ہے کہ اگر کوئی دشمن سر پر ہمارے آوے تو ہاتھ اس کا نہ پڑے۔“

ایک دن شہر کے باہر کچھ کام کرتے تھے کہ قضا کار ایک ریچھ جنگل میں نمودار ہوا۔ ان دونوں میں سے جو چست و چالاک تھا درخت پر چڑھ گیا اور دوسرا بیچارہ جان کے ڈر سے مانند مردے کے زمین کے اوپر لیٹ گیا اور دم چرایا۔ اس واسطے کہ ریچھ مردے کو ایذا نہیں دیتا۔ آخر اس نے نزدیک اس کے پہنچ کر سونگھا جب کہ کچھ حس و حرکت اس میں نہ دیکھی جانا کہ مردہ ہے۔ پھر اور راہ جنگل کی لی۔

اس دم یار اس کا درخت سے اتر کر آیا اور کہنے لگا ”اے یار! ریچھ تیرے کان میں کیا کہتا تھا؟“

اس نے کہا ”مجھ سے یہ کہتا تھا کہ ایسے بے وفایار سے دوستی نہ کیجئے۔“

فائدہ قصے کا یہ ہے جو کوئی اپنے قول قرار پر ثابت نہ رہے ساتھ اس کے دوستی رکھنی نہایت نادانی ہے۔



لقمان حکیم اور اس کا ایک دوست

کہتے ہیں کہ ایک روز لقمان حکیم اپنے گھر میں لڑکوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور اپنا تردد اور تفکر بھلاتا تھا۔ اتفاقاً ایک دوست اس کا اس وقت آ گیا اور اس کو لڑکوں کے ساتھ بازی میں مشغول پایا۔

کہنے لگا ”اے یار! باوجود اس کے کہ فراست میں تو شہرہ آفاق ہے پھر کس واسطے اپنے تئیں احمقوں میں ملایا ہے اور کس سبب سے عقل و فہم اپنے کھوئے ہیں؟“
اس نے کہا ”کس طرح سے؟“

اتفاقاً ایک کمان اس وقت لقمان حکیم کے پاس تھی۔ چلا اس کمان کا گوشے سے اتار کر اس کے آگے رکھ دی۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کیا اسرار ہے، اور بولا ”اے لقمان حکیم! یہ نکتہ عجیب مجھ پر نہ کھلا اور اشارہ موہوم تیرا میرے قیاس میں نہیں آتا کہ تو نے کمان کیوں اتاری ہے۔“

کہا اس نے ”اگر کمان سدا چڑھی رہے تو سست ہو جائے۔“

حاصل قصہ کا یہ ہے کہ سب لوگوں کو واجب ہے کہ ہر ہفتے میں ایک روز اپنے دل کے تئیں راحت دیویں۔ سیر و شکار اور لہو و لعب سے خوش کریں تا جو مشکل کہ ان کے پیش آوے اس کے حل کرنے میں سستی اور کاہلی نہ کریں!



چوہا اور میوہ فروش

کہتے ہیں کہ ایک چوہا برسوں سے کسی ایک میوہ فروش کی دوکان میں رہتا تھا اور خشک و تر میووں سے زندگی بسر کرتا تھا۔ دکان دار اس کی حرکات دیکھتا۔ ٹال دیتا اور اس کا

بدلہ نہ لیتا۔

ایک روز بہ سبب ہوس کے معدہ سفلہ دوں کا جو سیر ہوا، ہزاروں شور و شر پر وہ

دلیر ہوا۔

آخر بہ سبب حرص کے ہیمانی اس دوکان دار کی کتر کر جتنے روپے اشرفی اس میں

تھے اپنے بل میں لے گیا۔

دکاندار نے احتیاط کے وقت جو کیسہ ٹٹولا تو مفلسوں کی تھیلی کی طرح خالی پایا۔

معلوم کیا کہ یہ کام چوہے کا ہے۔ تب ناچار ہو کر اس کی جستجو کرنے لگا۔

اتفاقاً ایک روز اسے بلی نے پکڑا۔ اس نے اس کے منہ سے چھڑا ایک ڈور اس

کے پاؤں میں باندھ کر چھوڑا۔ وہ بل میں گیا۔ اس نے ڈورے کو یہاں تک ڈھیلا کیا کہ وہ

بل کی انتہا کو پہنچا اور ٹھہر گیا۔ تب اس نے سوراخ کو کھودنا شروع کیا۔

جب کھود چکا تو دیکھتا کیا ہے کہ مانند صرافوں کی دکان کے اشرفیاں روپیہ اس میں

پھیلے ہوئے پڑے ہیں۔ ان کو جمع کر اپنے تصرف میں لایا اور چوہے کی تیس نکال بلی کے

حوالے کیا۔ اس نے اپنے کئے کا ثمرہ پایا۔

حاصل قصے کا یہ ہے کہ کبھی تو حرص و طمع کی طرف خیال نہ کر بلکہ قناعت اختیار کر

کہ قانع ہونا موجب امن کا ہے!



امتیاز علی تاج

امتیاز علی تاج کا خاندان اصل میں سہارنپور کا تھا۔ ان کے والد ممتاز علی لاہور گئے اور وہاں سے تعلیم نسواں کے سلسلے میں مختلف کتابیں اور رسالہ ”تہذیب نسواں“ نکالا۔ تاج کو بچوں کے ادب سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے دارالاشاعت کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی غیر معمولی خدمت انجام دی۔ تاج کا مشہور ڈراما ”انارکلی“ اردو ادب میں خاصے کی چیز ہے۔ اس ڈرامے کو بجا طور پر تاج کا شاہکار کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک شاندار ادبی کارنامہ ہے اور اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نمایاں اور اہم سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

تاج نے ”چچا چھلکن“ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں چچا چھلکن کی مختلف حرکتوں اور عادتوں کو بڑے دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ شخصیت کا دلچسپ یا مضحکہ خیز ہونا کوئی ایسی بات نہیں، البتہ ان کو لفظوں کے ذریعہ سامنے لا کر رکھ دینا اور اس خوبی کے ساتھ کہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی اسے پڑھ کر ہنسنے سے باز نہ رہ سکے۔

اردو ادب میں تاج کی یہ کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔



قدسیہ زیدی

قدسیہ زیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی کی بیوی تھیں۔ آپ نے زندگی کا اہم حصہ نئی دہلی میں گزارا۔ ان کے ادبی زندگی کی ابتدا بچوں کی کتابوں سے ہوئی جس میں گاندھی بابا کی کہانی بہت مقبول ہوئی۔ اس کا پیش لفظ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا تھا۔ اس پر حکومت ہند نے انھیں انعام بھی دیا تھا۔ انھوں نے بچوں کے لئے

متعدد ڈرامے لکھے لیکن جلد ہی بچوں کے ادب کے ساتھ انھیں ڈراما نگاری کا شوق ہوا اور یہ شوق اس حد تک بڑھ گیا کہ آپ نے چند احباب کی مدد سے دہلی میں ”ہندوستانی تھیٹرز“ کی بنیاد رکھی اور تن من دھن سے اس کام میں لگ گئیں۔ اس تھیٹر کے ذریعہ بیگم زیدی نے متعدد ڈرامے پیش کئے جو دہلی کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں دکھائے گئے۔ انھیں عوام نے بے حد پسند کیا اور ان ڈراموں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔ بیگم زیدی کے زیادہ تر ڈرامے مشرق و مغرب کے اہم ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ انہوں نے ان ڈراموں میں ہندوستانی ماحول کو اس خوبی سے منتقل کیا کہ ان پر اصل کا شبہ ہوتا ہے۔ ان کی زبان سادہ اور چست ہوتے ہیں۔ بیگم زیدی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب وہ کسی ڈرامے کو اردو میں اپنانے کا خیال کرتیں تو چند روز میں اپنے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا کر لیتیں کہ گویا وہ اسی ماحول میں سانس لے رہی ہیں۔ اس ڈرامے سے متعلق تمام چیزیں پڑھ رہی ہیں۔ وہ جس لگن سے اپنے ادبی کام کرتی تھیں، وہ قابل رشک تھا۔

بیگم زیدی نے سنسکرت کے شاہکار ”شکنتلا“ کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کیا۔ اس کے لئے انھوں نے سنسکرت زبان سیکھی اور مہینوں کی ریاضیت کے بعد مکمل کیا۔ یوں تو شکنتلا کے ترجمے پہلے بھی ہو چکے ہیں لیکن بیگم زیدی کا ترجمہ منفرد تھا۔

ابھی اردو ادب میں ان کے کاموں کا پورے طور پر جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ان کی بہت سی کتابیں ابھی شایع نہیں ہوئی ہیں لیکن جب یہ کام ہوگا تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انھوں نے اتنے تھوڑے عرصہ میں کتنا کام کیا ہے۔

بیگم زیدی نے امتیاز علی تاج کی مشہور کتاب ”چچا چھکن کے چار روپوں کو ڈرامے کی شکل دی۔“ تلاش“ اس کا ایک روپ ہے۔ یہ چاروں ڈرامے اکثر اسکولوں میں ایچ بھی کئے جاتے ہیں۔

تلاش

کردار: چچا، چچی، وڈو، چھٹن، بنو، اماں جی، بندو، خانصاحب

ملازم :

[دالان میں ایک چارپائی، ایک تخت جس پر میلے کپڑے رکھے ہیں، دو کرسیاں، ایک دو چھوٹی میزیں، صراحی وغیرہ ہیں۔ فرش پر کاغذ، چھپٹیاں اور رسی کے ٹکڑے پڑے ہیں۔ پچھلی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو غسل خانہ میں کھلتا ہے۔ دائیں ہاتھ کا دروازہ باورچی خانے کو، بائیں کا باہر جاتا ہے۔ سامنے دیوار پر ایک ربڑ کی تھیلی ٹنگی ہے۔

چلے گا جاڑا ہے۔ صبح کے تین بجے ہیں۔ چچا سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے سو رہے ہیں۔ کمرہ ان کے خراٹوں سے گونج رہا ہے۔ بائیں ہاتھ کا دروازہ کوئی دھڑ دھڑ پیٹ رہا ہے۔ جواب نہ ملنے پر پھر پیٹتا ہے۔]

چچا : لحاف میں سے ہاتھ نکال کر لیمپ جلاتے ہیں۔ پھر نہایت احتیاط سے منہ لحاف میں

سے نکالتے ہیں۔ گھڑی میں وقت دیکھ کر (لاحول ولاقوة! کون ہو جی؟

(زور دار دستک) دم بھی لوگے یا پیٹے ہی جاؤ گے کواڑ؟ (لحاف میں سے نکلتے ہیں۔

کنٹوپ پہنتے ہیں، رضائی اوڑھتے ہیں اور سو سو کرتے ہوئے بائیں ہاتھ کے

دروازے کی طرف جاتے ہیں) یہ بھی کوئی وقت ہے بھلے آدمیوں کو جگانے کا؟

(دروازہ کھول کر) اے پاجی تو اس وقت کیا کر رہا ہے یہاں؟

ملازم : خانصاحب کے پیٹ میں بہت درد ہے۔ انھوں نے تمہاری ربڑ کی تھیلی منگوائی ہے۔

چچا : بس کھا گئے ہوں گے رات دعوت میں انا پ شاپ۔ آخر کھانا کسی اور کا تھا تو پیٹ تو خانصاحب کا اپنا تھا۔ (جمائی لے کر) کوئی یہ پوچھے کہ بھلا اناڑی کی سی تو پ بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر پٹھان جو ٹھہرے اور پھر یہ کہ صبح تین بجے پیٹ میں درد کر لیا۔ ملازم : خانصاحب کے پیٹ میں تو دو بجے سے درد ہے۔

چچا : لیجئے ذرا غور تو فرمائیے۔ شریف آدمی کچھ تو وقت کا لحاظ رکھا ہوتا۔ بے وقت کی راگنی اسی کو تو کہتے ہیں۔

ملازم : اجی کوئی یہ بھی اپنے بس کی بات ہے؟

چچا : تو پھر کیا ہمارے بس کی بات ہے۔ خیراتی ہسپتال میں داخل کیوں نہ ہو گئے یہ تو گھر ہے، کوئی شفا خانہ تو ہے نہیں کہ جس وقت جس کا جی چاہا سوتوں کو بے آرام کیا اور ربڑ کی تھیلی طلب کر لی۔

ملازم : تو پھر۔۔۔

چچا : تو پھر کیا۔ اب آیا ہے تو لیتا ہی جا تھیلی۔ رک۔ ہم ابھی لائے دیتے ہیں (دیوار پر سے تھیلی اتار کر دیتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں) نا معقول انسان (کنٹوپ اور رضائی اتار کر رکھ دیتے ہیں اور لحاف میں گھس جاتے ہیں۔ لیمپ بڑھا کر منہ لحاف سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک بار پھر کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ لحاف میں سے منہ نکال کر) اب یہ کہلوایا ہوگا کہ انتقال فرما گئے ہیں۔ آ کر تجھیز و تکفین کا انتظام کر دو۔ مردود! (لیمپ جلاتے ہیں۔ جا کر دروازہ کھولتے ہیں تو خانصاحب کا نوکر تھیلی لئے کھڑا ہے۔)

ملازم : خانصاحب نے کہا کہ اسے اپنے پاس انڈے دینے دیجیے۔ ہم بوتل سے کام چلا لیں گے اور اب کبھی ہم سے پالش کی شیشی منگا کر دیکھئے گا۔

چچا : (تھیلی ہاتھ میں لئے دم بخود کھڑے ہیں) ارے کبخت صبح صبح پرائیویٹ بات جا کر خان صاحب سے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو ہم نے۔۔۔

ملازم : اور خان صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ جب بیمار ہوں تو خیراتی ہسپتال میں چلے جائیے گا۔

چچا : ذرا ملاحظہ تو فرمائیے شرافت خان صاحب کی، بھلا نوکر کے ہاتھ اخلاق سے ایسی گری ہوئی بات کہلوا بھیجنا کہاں کی انسانیت ہے (دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ ربرڈ کی تھیلی تخت پر پٹک دیتے ہیں اور آ کر پھر لیٹ جاتے ہیں) جیسے ان کے باپ کی میراث مجھے ربرڈ کی تھیلی ملی تھی۔۔۔ ہونہہ، اور مزاج تو دیکھو پٹھان کا کہ اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجئے مرغی کے۔۔۔ دھمکی دیتا ہے کہ پالش منگا کر دیکھئے (اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں) جیسے شہر بھر میں یہی تو ایک موچی رہ گیا ہے (لیٹ کر لیمپ بڑھا دیتے ہیں سونے کی کوشش کرتے ہیں)۔ (لحاف میں سے منہ نکال کر) کبخت اجالا ہی نہیں ہو چکتا کہ امامی چلم ہی بھراتا۔ (بیٹھ جاتے ہیں) سارا گھر پڑا سو رہا ہے جیسے کبختوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ (کھڑے ہو جاتے ہیں) افلاطون۔ اور آخر اس میں جھوٹ بھی کیا ہے کہ گھر ہے کوئی خیراتی ہسپتال تو ہے نہیں کہ جس وقت جس کا جی چاہا سوتوں کو بے آرام کیا اور ربرڈ کی تھیلی طلب کر لی) آخر کوئی چندے کی تھیلی ہے اور پھر یہ مزاج کہ اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجئے۔ (دائیں ہاتھ کے دروازے سے باورچی خانے میں جاتے ہیں وہیں سے) گھرداری کرنے چلی ہیں۔ (اندر آتے ہیں) اتنی توفیق نہیں کہ سونے سے پہلے بھوبھل میں لکڑی دبا دیں (چارپائی کے پاس آتے ہوئے) اور ہر وقت کی ضد کہ یہ کرتی ہوں میں وہ کرتی ہوں۔ میں کام سے مری جاتی ہوں۔ (غصہ میں آ کر) حالت یہ ہے کہ گھر میں پالش تک منگا کر رکھنے کا ہوش نہیں۔ ضرورت ہو تو ہمسایوں کے ہاں سے پالش منگایا جاتا ہے۔ (چارپائی پر بیٹھ کر) اور اس کم ظرف کو دیکھو کہ پالش کیا

دے دی حاتم کی گورپرلات ماردی۔ جو برابر پالش لے لی تو بدلے میں ربڑ کی تھیلی انھیں بخش دو کمینہ کہیں کا۔ (اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں) اور بیوی صاحبہ کو دیکھنے کہ جنھیں اتنا خیال نہیں کہ چلم کے لئے تھوڑی سی آگ کا انتظام کر دیں (بڑبڑاتے ہوئے کاغذ جھپٹیاں رسی وغیرہ جمع کرتے ہیں۔ پھر باورچی خانے میں جا کر لوہے کی انگیٹھی لاتے ہیں۔ میز پر سے ماچس لے کر انگیٹھی میں آگ جلاتے ہیں۔) لیجئے اب تمباکو تلاش کیجئے (پھر باورچی خانے میں جا کر لپٹن چائے کا گندا ساٹین زمین پر پٹخ دیتے ہیں) کنبخت خالی پڑا ہے۔ تمباکو ہاتھ دھولے (امامی بیچ کے دروازے سے غسل خانے میں جاتا ہے۔ چچی بستر وغیرہ ٹھیک کرتی ہیں۔ پھر دائیں سے باہر چلی جاتی ہیں) (باہر سے) منھ دھو چکا ہو تو ادھر باورچی خانے میں آ جا۔

امامی : ابھی آیا (غسل خانے میں سے منھ پونچھتا ہوا نکلتا ہے اور دائیں سے باہر چلا جاتا ہے)
چچا : (بائیں سے اندر آتے ہیں چہرہ تمتمایا ہوا ہے بڑبڑا رہے ہیں) ربڑ کی تھیلی بخش دو باپ کی میراث، موچی کہیں کا۔

امامی : (کشتی میں چائے لے کر آتا ہے)۔ بیوی نے چائے بھجوائی ہے۔

چچا : لے جا واپس اور کہہ دے کہ اسے بھی اٹھا کر طاق میں رکھ دیں۔

(امامی چائے لے کر چلا جاتا ہے) نوکروں کے سامنے کیا ہمسایوں کے سامنے تک مجھے رسوا کر ڈالا۔ ورنہ اس پٹھان کی طاقت تھی کہ پالش کا طعنہ دے جاتا۔ آخر کوئی حد بھی ہو۔ بس اب ہو چکی۔۔۔ اب نہیں ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔۔۔ مگر انکار۔۔۔ جب دیکھو نوکروں کی طرف داری۔۔۔۔۔ زندگی اجیرن کر ڈالی۔۔۔ آیا تھا بڑا طاق۔۔۔ طاق کا بچہ۔۔۔۔۔ طاق میں پالش کی شیشی منگا کر نہ رکھی گئی۔ شیشی ہوتی تو میں کیوں منگاتا اس چمار سے پالش میری عقل ماری گئی تھی۔۔۔ جو برابر پالش لے کر ربڑ

کی تھیلی انھیں دے ڈالو۔ بڑے آئے کہیں کے۔

(دائیں ہاتھ کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اندر جھانکتے ہیں، پھر واپس لوٹتے ہیں۔ ہم نہیں پیس گے چائے، امی کو پلا دیں (بائیں ہاتھ کے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)

(دو اور چھٹن اندر آتے ہیں۔ دو تو لیہ ہاتھ میں لئے ہے۔ غسل خانے میں چلا جاتا ہے۔ چھٹن لٹو سے کھیلتا ہے غسل خانے کا دروازہ بند ہے۔ پانی گرنے کی آواز آتی ہے۔ چھٹن لٹو چھوڑ کر جاتا ہے اور غسل خانے کا دروازہ پٹیتا ہے۔)

چھٹن: جلدی نکلو ہم بھی نہائیں گے۔

دو: (اندر سے) نہیں نکلتے۔ نہالیں گے تو نکلیں گے۔

چھٹن: (دروازہ پیٹ کر) نکلو گے کیسے نہیں۔

دو: جاؤ جا کر اماں سے کہہ دو۔

چھٹن: نکلو۔۔۔ نکلو۔۔۔ (دروازہ پٹیتا ہے۔ پھر جا کر لٹو سے کھینے لگتا ہے) چچا غصے میں اندر

آتے ہیں اور سیدھے غسل خانے کے دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ دروازہ بند ہے چچا کا سر اس سے ٹکراتا ہے)

دو: (اندر سے) نہیں مانے گا تو چھٹن۔ میں اماں سے جا کر کہہ دوں گا، چھٹن مجھے نہانے نہیں دیتا۔

(چھٹن ہنسی کے مارے بے قرار ہو جاتا ہے۔ چچا سر سہلاتے ہیں۔ پھر چھٹن کو ہنستے ہوئے دیکھ کر اس کی طرف لپکتے ہیں۔ چچی دائیں سے اندر آتی ہیں۔ چھٹن دوڑ کر چچی سے لپٹ جاتا ہے۔ چچا بے بس ہو کر لوٹتے ہیں اور چھٹن دائیں کو چلے جاتے ہیں۔)

(غسل خانے کا دروازہ پیٹ کر) نکل باہر۔

(اندر سے) نہا تو لوں۔۔۔

نہیں ابھی نکل۔۔۔

صابن تو اتار لوں۔۔۔

کہہ جو دیا کہ ابھی نکل جیسا ہے ویسا ہی نکل۔۔۔

ابا صابن لگا ہے۔۔۔

آتا ہے باہر یا بتاؤں میں۔ صابن ہے تو ہوا کرے۔

(دڈو صابن منہ اور جسم پر ملے دھڑ سے تولیہ لپیٹتے اندر آتا ہے) پاجی کہیں کا نکل ہی نہیں

چکتا تھا۔ ابے کہا جو تھا ہم نے جیسا ہے ویسا ہی نکل آ چنچوائے چلا جاتا ہے (ایک چائٹا

رسید کرتے ہیں)

(روتا ہے) صابن گھس گیا آنکھوں میں (روتا ہے)

(فوراً غسل خانے میں گھس جاتے ہیں اور اندر سے چٹخنی چڑھالتے ہیں۔ دڈو دروازے

پر کھڑا رو رہا ہے) تو نہیں چپ ہوگا (دڈو روتا ہے)۔

دیکھ میں کہتا ہوں سرک جا یہاں سے، نہیں اچھا نہ ہوگا۔ میں دروازہ کھول کر اتنی لگاؤں

گا کہ اماں ربڑ کی تھیلی سے سینک کرتی پھریں گی۔

چچی : (دائیں سے اندر آتی ہیں) کیا ہوا لال کیوں رو رہا ہے؟ آجا تو میرے پاس آجا۔

دڈو : (رو کر) ابا نہانے نہیں دیتے۔ غسل خانے میں سے نکال دیا۔ دیکھو تو اماں سارے

پنڈے پر صابن لگا ہے۔

چچی : حد کرتے ہیں بعض دفعہ تو بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں اور آج صبح تو نہ جانے کیا

آفت آرہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے لڑ کر آئے ہیں۔ چلو میں تجھے نہلا دوں۔

پھر کوئی اور کام کروں گی۔ (چچی دڈو کو لے کر دائیں کو جا رہی ہیں۔ چچا غسل خانے کا

دروازہ کھول کر دیکھتے ہیں پھر بند کر لیتے ہیں۔ ددو اور چچی لوٹ کر آتے ہیں۔)
 چچی : (غسل خانے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر) چھٹن کے ابا دوسرا تولیہ لادوں۔
 تولیہ تو بچہ باندھ کر چلا آیا ہے۔
 (پانی گرنے کی آواز)

چچی : (ددو سے) چل تو، تو چل، نہیں لیتے تولیہ تو نہ لیں۔ (دونوں چلے جاتے ہیں)
 چچا : (دروازہ کھول کر اندر آتے ہیں۔ گیلا کرتہ پاجامہ پہن رکھا ہے) ہو نہہ! (بائیں
 دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں۔ پھر فوراً ہی اندر آتے ہیں جیسے کچھ ڈھونڈ رہے
 ہوں۔ غسل خانے میں جاتے ہیں پھر اندر آتے ہیں۔) نہ جانے کہاں چلی گئی۔ (طاق
 میں تلاش کرتے ہیں) طاق سب چیزیں طاق بدمعاش، پالش کی شیشی منگوا کر
 دیکھئے گا۔“ بس یہی تو خرید سکتا ہے پالش اور تو سب فلائج ہیں۔ ایک دم سے چھ
 شیشیاں خرید کے لاؤں گا اور سب کو طاق پاجی حرام خور تمباکو اٹھا کر طاق میں رکھ
 گیا مگر اس پٹھان کے ہاتھوں ذلیل کرادیا۔ (اکڑوں بیٹھ کر نعمت خانے کے نیچے
 دیکھتے ہیں) لاحول ولاقوۃ۔ گئی تو کہاں گئی (تکیے کے نیچے دیکھتے ہیں) آخر پر تو نہیں
 لگ گئے اسے (تخت پر رکھے ہوئے کپڑوں کو ٹٹول کے دیکھتے ہیں) یہاں بھی نہیں
 (چاروں طرف گھوم کر) اس گھر میں ہر چیز غائب ہو جاتی ہے۔ پھوہڑپن کی حد
 ہوگئی۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اگر پالش کی شیشی منگوا کر رکھ لیتیں تو کیا حرج تھا (پھر
 تلاش میں لگ جاتے ہیں) تخت پر کے میلے کپڑے اٹھا کر ایک ایک کر کے جھاڑتے
 ہیں) کم بخت سوئی بھی ہو تو الگ ہو کر گر پڑتی۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ (لوٹوں کے نیچے
 دیکھتے ہیں) سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں ہو سکتی ہے (داڑھی کھجاتے ہیں) اچھا صبح سے
 شروع کروں۔ صبح خانصاحب اپنے پاس انڈے دینے دیجئے۔ بدمعاش!

رات کے تین بجے پیٹ میں درد کر لیا۔ تکلیف دہ انسان اور یہ نہیں کہ صبح تک انتظار کر لیں، نہیں لاٹ صاحب کے بچے رات کے تین بجے جگوائیں گے شریف آدمیوں کو۔ اور اسے دیکھو کہ صبح صبح جا کر پرائیوٹ بات خانصاحب سے کہہ دی۔ کمینہ، کم ظرف۔ بھلا یہ بات ان سے کہنے کی تھی (پھر بستہ ٹٹولتے ہیں) یعنی حد ہوگئی۔ ارے او (رک جاتے ہیں) بندہ نامعقول۔ گدھا۔ خوب یاد آیا۔ صبح باورچی خانہ میں گیا تھا انگیٹھی لینے۔ شاید وہیں رکھ دی ہوگی۔ (باورچی خانہ میں جھانکتے ہیں) دیکھی بیگم صاحبہ کی حرکت، ایسی چپ چپ اور انجان سی بنی بیٹھی ہیں گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ہونہہ! اس طرف نظر ہی نہیں اٹھاتیں۔ چہرے پر کیا پارسائی اور شہد پن برس رہا ہے۔ (چٹکی بجا کر) اب آیا سمجھ میں۔ بھٹیارہ ہے نمازی تو ضرور ہے۔ دعا بازی۔ انہوں نے ہی چھپا رکھی ہے۔ تبھی تو بے نیازی کا یہ عالم ہے۔..... خیال ہوگا کہ آخر ہار جھک مار کر مانگنے آئے گا۔ (پھر جھانکتے ہیں) اب اس طرف دیکھانا۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ چپکے چپکے میری پریشانیوں کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ اس بچپن کی بھلا کوئی حد بھی ہے۔ میں نے بھی بیگم صاحبہ کا پاندان ہی غائب نہ کیا ہو تو کہنا۔ (مووا اندر آتا ہے) کیوں بے مووے! بیوی کیا کر رہی ہیں؟

مووا : ہنڈیا بگھار رہی ہیں۔ (چلا جاتا ہے۔ بائیں ہاتھ کے دروازے سے)

چچا : (ٹہلتے ہیں) کیا بیہودہ مذاق ہے۔ اور اگر میں ان کی اوڑھنی کو دیا سلائی دکھا دوں جب؟

بنو : (بنو اندر آتی ہے۔ ہنڈکلیا کا سامان لئے ہوئے ہے) ابا میاں گڑ کے چاول کھاؤ گے؟

چچا : ادھر تو آبنو۔ ایک کام کیجیو۔ ہماری عینک کھوگئی ہے۔ باورچی خانے میں رکھی تھی۔

ڈھونڈ کر لا دے۔

بنو : کون سی عینک؟

چچا : احمق کہیں کی۔ جو عینک ہم لگاتے ہیں اور کون سی، مگر دیکھ تیری اماں کو نہ معلوم ہونے پائے۔

بنو : (مسکرا کر) اپنی عینک لگا تو رکھی ہے آپ نے۔

چچا : (چونک کر ہاتھ آنکھوں کی طرف بڑھاتے ہیں) ہیں! (اتارتے ہیں۔ ہاتھ میں لے کر گھماتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ پھر بنو کی طرف دیکھ کر) یہ یہیں تھی۔ کب لگائی تھی ہم نے؟

بنو : (زور سے قہقہہ لگاتی ہے) اماں! اماں! ہم تو اماں کو سنائیں گے۔ (بھاگنے لگتی ہے)۔

چچا : (لپک کر اسے پکڑ لیتے ہیں) ہیں ہیں! کیا ہوا؟ کہاں چلی؟ گلاب جامن کھائے گی، اری وہ بات تو ہم نے مذاق میں کہی تھی، پاگل کہیں کی۔ اس میں اماں کو سنانے کی کیا بات ہے۔ دیوانی ہوئی ہے۔ کیا لائیں تیرے لئے بازار سے؟

بنو : (بھاگنے کی کوشش کرتی ہے) اماں! اماں!!

چچا : تھپڑ ماروں گا میں۔

بنو : اماں! اماں!!

چچا : بدتمیز (بنو کو دھکادے دیتے ہیں۔ وہ گر کر رونے لگتی ہے۔ چچا جلدی سے بائیں ہاتھ کے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)

چچی : (باورچی خانے سے) بنو۔ او بنو۔ کیوں ریں ریں کر رہی ہے۔ کیا ہوا؟

(چچی دائیں سے آتی ہیں۔ بنو کو اٹھا کر پیار کرتی ہیں) کیوں رو رہی ہے۔ صبح صبح کس نے مارا؟

بنو : ابا..... (رو کر) ابا.....

چچی : کوئی شرارت کی ہوگی؟

بنو : (ناک پونچھتے ہوئے) نہیں ابا کی عینک.....

چچا : (بانیں سے اندر آتے ہیں۔ بڑی سی ٹوکری مٹھائی کی ہاتھ میں لئے ہیں) ابے

اوپھٹن، اوللو، چلو۔ آؤ ہم تمہارے لئے مٹھائی لائے ہیں۔ لے بنو بیٹا تو بھی لے۔

(سب کو مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ چچی باورچی خانے میں چلی جاتی ہیں) لے دڈو تو

ایک اور حصہ لے اور بنو تو بھی لے۔ (کاغذ پر مٹھائی رکھ کر) لے بندو یہ بیوی کو دے آ

(بندو مٹھائی کو لے کر دائیں کو جاتا ہے۔ سب بچے مٹھائی کھاتے ہیں)۔

چچا : (فٹ لائٹ کے قریب آ کر) او امامی ذرا ادھر تو آیا۔ یہ لو تم ایک آنہ اور اگر کام کرو تو

چونی انعام۔ دیکھ خانصاحب نگر کی دوکان پر حجام کے ہاں بیٹھے خط بنوارہے ہیں۔

بائیسکل ان کا دوکان کے باہر رکھا ہے۔ تو چپکے سے جا کر ان کے بائیسکل میں پنکچر کر

دبجو۔ بڑے آئے پالش کی شیشی والے۔

☆☆☆

صالحہ عابد حسین

صالحہ مصداق فاطمہ نام 1913ء میں پانی پت میں پیدا ہوئیں۔ علمی اور تعلیمی ماحول میں پرورش پائی۔ ادبی سفر کا آغاز 1939ء کے آس پاس کیا۔ عابد حسین صاحب سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد صالحہ عابد حسین کے نام سے شہرت پائی۔

صالحہ عابد حسین نے کثیر تعداد میں مسائل اور موضوعات کو اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے۔ ان میں سیاسی، سماجی، تحقیقی اور بچوں کے لیے کتابیں شامل ہیں۔ انہوں نے قریب 42 کتابیں تصنیف کیں جن میں ساز ہستی، نراس میں آس، ٹوٹکے، آتش خاموش عذرا، قطرے سے گہر ہونے تک، راہِ عمل، سلسلہ روز و شب اور حالی کی سوانح حیات اہمیت کی حامل ہیں۔ ”سفر زندگی کے لیے سوز و ساز“ ان کی سوانح ہے۔ ان کا انتقال 8 جنوری 1988ء کو دہلی میں ہوا۔

صالحہ عابد حسین کی تحریریں سلیس، سادہ اور رواں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات کو پُر اثر اور شگفتہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اپنے بے شمار مضامین، ناول اور دوسری تخلیقات کے ساتھ وہ اردو ادب کا اٹوٹ حصہ ہیں۔



ہندوستان جنت نشان

کلام پاک میں سفر و سیاحت کی تاکید بار بار آتی ہے۔ اسلام نے سیاحت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ ”علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے۔“ یہ مشہور حدیث بھی سیاحت کی تعلیم دیتی ہے!

لیکن جب میں یہ کچھ نہیں جانتی تھی تب سے سیر و سیاحت کی شوقین تھی۔ کیسے اور کب یہ شوق پیدا ہوا جانے۔ میرا بچپن جس ماحول میں گزرا وہاں سفر و سیاحت کا عورتوں کے ذہن میں خیال بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا یہ اور بات ہے کہ شوہر، باپ یا بیٹے کی نوکری کے سلسلے میں پانی پت سے باہر قریب اور دور کے شہروں میں عورتیں اور لڑکیاں آیا جایا کرتی تھیں۔ میری والدہ بھی اس سلسلے میں میرٹھ، دلی، لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ جاتی آتی رہتی تھیں۔ مگر یہ میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔ اب تو وہ کبھی کبھار ڈاکٹر رحمان یا ڈاکٹر انصاری کو دکھانے کے لیے جایا کرتی تھیں اور کبھی کبھی مجھے بھی کہ سب سے چھوٹی تھی ساتھ لے لیتی تھیں۔ باجی کی شادی کے بعد ان کے ساتھ دو تین بار میرٹھ بھی گئی۔ بھائی جان کی انگلینڈ سے واپسی کے بعد علی گڑھ میں سکونت ہی اختیار کر لی گئی تھی اور اسی زمانے میں ایک بار شملہ، ایک بار کمارہٹی اور ایک بار گھوڑا کھال، اماں کے علاج کے سلسلے میں جانا ہوا تھا۔ بھائی جان کی شادی کے بعد دو بار نینی تال بھی گئی۔ جیسا کہ میں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے، اماں کے ساتھ عراق کی زیارات کے لیے بھی جانا ہوا تھا۔ یہ سب سفر و سیاحت کی خاطر نہ تھے پھر بھی جہاں ہم جاتے تھوڑی بہت سیر تو کر ہی لیتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی سیر اور باہر کے ملکوں کی سیاحت کے مواقع مجھے دراصل شادی کے بعد ملے اور میں نے اپنی محدود آمدنی اور وسائل کے باوجود دل کھول کر سیر و سفر کیا۔

شادی کے بعد میں نے اپنے شوہر سے ایک ہی فرمائش کی تھی کہ مجھے سیاحت کا بہت شوق ہے اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم دونوں انشاء اللہ نہ صرف ہندوستان دیکھیں گے بلکہ باہر کے ملکوں کی سیاحت بھی کریں گے۔ اُس وقت تو بیماریوں نے گھیر لیا اور کئی برس تک میں دلی سے باہر جانے کے قابل بھی نہ تھی لیکن گذشتہ اڑتیس چالیس سال میں، میں نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی جتنی سیاحت کی وہ میرے طبقے اور میری حیثیت کی عورتوں کے نصیب میں بہت کم آتی ہے۔

۱۹۶۶ء کے بعد میری صحت کی کمزوری کی وجہ سے عابد صاحب گرمی میں دلی سے باہر کسی پہاڑی مقام پر جانے کا پروگرام بنایا کرتے تھے۔ زمانہ سستا تھا۔ کرائے کم تھے۔ پہاڑ پر ٹھہرنے کا انتظام کسی دوست کی وساطت سے مفت یا بہت کم پیسوں میں ہو جاتا تھا۔ وہاں جا کر ہم دونوں لکھنے کا کام بھی کرتے اور سیر بھی۔ اسی طرح میں نے ہندوستان کے مشہور پہاڑی مقامات دیکھے۔ شملہ چار یا پانچ بار گئی۔ نینی تال میں بھابی جان کا گھر تھا کئی بار وہاں جانا ہوا۔ دوبار رانی کھیت کی بھی سیر کی۔ وہاں سے الموڑا جانا بھی ہوا۔ مہابلیشور تین دن جا کر رہے جہاں عابد صاحب کسی کانفرنس میں گئے ہوئے تھے۔ یہ بڑا ہی سرسبز، پُر فضا اور دلکش مقام ہے۔ لیکن سب سے زیادہ سیر میں نے کشمیر کی کی ہے۔ بھائی جان وہاں ڈائریکٹر تعلیمات ہو کر گئے تو پہلے ہی سال ہم دونوں کو ساتھ لے گئے اور پھر ہر سال (چھ یا سات بار ہم دو ڈھائی مہینے گرمی کے ان کے ساتھ جا کر گزارتے تھے۔ اس سات سال میں ہم نے کم و بیش سارے کشمیر کی سیر کر ڈالی۔ بھائی جان کو خود شوق بھی تھا اور ان کے فرائض منصبی میں بھی تھا کہ وہ دورہ کریں اور وہ مجھے اور بھابی جان اور عابد صاحب کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ سری نگر اور اس کے آس پاس کے علاقے تو چھان ہی ڈالے۔ اس کے علاوہ پالم پور، سون مرگ، یوس مرگ، مانس بل جھیل (جس کے چاروں طرف کنول کے پھولوں کے تختے اُسے عجیب حسن بخشتے ہیں) اچھا بل ککر ناگ، انت ناگ کے آب

حیات کے سے چشمے دیکھے۔ ان کا ٹھنڈا میٹھا پانی پیا اور ان کے حسن سے آنکھوں کو تراوٹ بخشی۔ وائل کا جھولتا پل خود ایک عجیب چیز ہے اور پھر دریا کا حسن اور اس کے رنگ برنگے پتھر جو جواہرات کو مات کرتے ہیں۔ انت ناگ کی جھیل مقدس مانی جاتی ہے۔ اس کے پاس ایک مشہور قدیم مندر بھی ہے جس کی پوجا کے لیے لوگ ہر وقت آتے رہتے ہیں اور مچھلیوں چیونٹیوں اور پنڈتوں کو کھلاتے اور دکھشنا دیتے رہتے ہیں۔ اس سے آگے چل کر مٹن کا مشہور شہر ہے جس کی ایک اونچی پہاڑی پر جو بہت ہی سرسبز و حسین ہے ڈاک بنگلہ بنا ہوا ہے جس میں جا کر ہم لوگ کئی دن رہے اور میلوں آس پاس سیر کرتے رہے تھے۔ جموں کے راستے سری نگر جاتے آتے کئی بار ویری ناگ جھیل کو دیکھا حسب دستور مغلوں نے اس کے گرد بھی ایک وسیع و حسین باغ بنوادیا تھا۔ اس جھیل کی گہرائی کی کوئی حد نہیں ہے۔ اسی سے دریائے جہلم نکلتا ہے ہزاروں برس سے کروڑوں ٹن پانی اس میں بہتا رہتا ہے اور دریائے جہلم میں کبھی پانی کی کمی نہیں ہوتی۔ اس گول جھیل کے پانی کے اندر ہاتھ ہاتھ بھر کی لاکھوں ٹیالے رنگ کی مچھلیاں موجود ہیں جو ذرا سے چنے یا کھانے کی کوئی چیز ڈالو تو سینکڑوں کی تعداد میں اس پر جھپٹی ہیں۔ اکثر مسافر اس کو بھی مقدس مانتے اور اس کے گرد طواف کرتے رہتے ہیں۔ یوں تو کشمیر کا چپہ چپہ جنت ارضی معلوم ہوتا ہے لیکن مجھے پہل گام سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کی سیر سے کبھی جی نہیں بھرتا۔ پہاڑوں کی شان و شوکت و سرسبزی اور درختوں اور پھولوں کی شادابی، دریا سے لدر کا بے مثال حسن، جس کے موتی جیسے شفاف پانی نے اس چھوٹی سی وادی کو سچ مچ وادی مینوا سا بنا دیا ہے۔ پہل گام سے اوپر اونچی پہاڑیوں پر جائیے تو اور شاندار اور خوبصورت مناظر ملتے ہیں۔ آڑو اور چندن واڑی کی بلندیوں پر تو ہم سب گئے ہیں اور راستے میں تڑپتا ہوا چشموں کا سیماب اور بہتی ہوئی چاندی کی سی آبشاریں، اونچی اونچی برف پوش چوٹیاں اور گہری سرسبز وادیاں ایک طرف نظروں کو اسیر کر لیتی ہیں تو دوسری طرف گھوڑوں کے پھسل جانے کے ڈر سے خوف

بھی معلوم ہوتا ہے۔ عابد صاحب تو ہر جگہ پیدل ہی جاتے تھے۔ چندن واڑی پہنچ کر دور تک چشمے پر جمی ہوئی برف سڑک کے مانند دیکھ۔ اس پر چلے، برف توڑ کر کھائی اور سردی سے جم جم گئے۔ امر ناتھ یا ترا کرنے کو بہت جی چاہتا تھا مگر یہاں تو یہ حال کہ۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، مگر دوسرے ساتھی شوقین نہ تھے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ کبھی نہیں بھولتا۔ ایک بار ہم سری نگر سے کچھ دن جا کر پہل گام رہے تھے اور نکرناگ کے صحت بخش پانی کے شوق میں عابد صاحب آٹھ دن وہاں بھی ٹھہرے تھے۔ واقعی ان پانچ حسین چشموں کا پانی اتنا لطیف، صحت بخش اور ہاضم تھا کہ ایک ہفتے میں عابد صاحب کا میرا، زہرا اور صابر کا (جو ہمارے ساتھ تھیں) کئی کئی پاؤنڈ وزن بڑھ گیا۔ کھانا ادھر کھایا ادھر ہضم یہاں ایک تو یہ نقشہ دیکھا کہ سری نگر کے ایک مسلمان کلکٹر صاحب پک نک کے لیے آئے تو اپنے ساتھ بوتلوں میں پکا پانی، سوڈا اور شراب لائے اور چشمے کا آب حیات چھوڑ کر وہ کڑوا زہر ذوق و شوق سے میز کرسی پر بیٹھے نوش جان کرتے رہے۔ دوسرا واقعہ واپسی پر بس میں پیش آیا۔ ہمارے قریب دلی کے دو سیٹھ بیٹھے تھے بہت بیزار اور نالاں فرمانے لگے ”یار بڑی تعریفیں سنی تھیں اس کشمیر کی۔ سری نگر دیکھا، پہل گام دیکھا گل مرگ دیکھا، یہاں ہے کیا سواٹو اور پٹو کے۔“ اور میں ان کو دیکھتی رہ گئی سچ ہے:

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

گل مرگ کئی بار گئے۔ زمردیں پیالے کی سی نو ہزار فیٹ کی بلندی پر یہ دادی حسن و شادابی کا بڑا ہی دلکش منظر پیش کرتی ہے۔ اس سے تین میل نیچے ٹنگ مرگ کی وادی ہے جس کا چشمہ دریا کے برابر چوڑا ہے اور ایسے ایسے رنگ ایسے ایسے منظر دکھاتا ہے کہ سبحان اللہ تیری قدرت بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔ دریا، چشمے، سمندر بہتا پانی میری کمزوری ہے۔ اس کا حسن مجھے مسحور کر دیتا ہے۔ گل مرگ سے تین میل پتلی پگڈنڈیوں پر پیدل یا ٹو پر سوار ہو کر کھلن مرگ جاتے ہیں یہاں برف جمی ملتی ہے اور ایک طرف دور

سری نگر کی وادی اور دوسری طرف ہمالیہ کی سر بفلک برف کا تاج پہنے مشہور چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں کی ہوا ہلکی ہے۔ میرا سانس رکتا محسوس ہوتا تھا مگر اس وقت ان باتوں کی پروا کسے تھی۔ واپسی نہ صرف کھلن مرگ سے گل مرگ بلکہ وہاں سے ٹنک مرگ تک دوڑتے بھاگتے پیدل ہوتی تھی۔ جیسا میں نے کہا عابد صاحب تو ہر چڑھائی اترائی پیدل ہی طے کرتے تھے۔ ایک بار ذاکر صاحب بھی ساتھ تھے۔ پہلے تو گھوڑے سے ڈرے اور نہیں بیٹھے مگر گھوڑے والے بھی بڑے ”مردم شناس“ ہوتے ہیں ساتھ ساتھ آنے لگے۔ ذاکر صاحب ذرا دور چڑھ کر ہانپ گئے اور مجبوراً گھوڑے پر بیٹھنا پڑا۔ بھائی جان نے پوچھا ”ذاکر صاحب کیا ہے۔“ فرمایا ”متفکر“ پھر بولے ”گھوڑے سے پوچھیے اس کا کیا حال ہے۔“ راستے بھر ان تینوں دوستوں میں نہایت پر لطف اور لطیف مذاق اور فقرے بازی ہوتی رہتی تھی۔

بھائی جان باندی پور کے دورے پر گئے تو میں، عابد صاحب، بھابی جان اور ان کی لڑکیاں سبھی ساتھ تھے۔ اس وقت یہ راستہ نیا نیا بنا تھا اور خطرناک تھا۔ سیدھی چڑھائیاں اور اتار بعض وقت حادثے ہو جاتے تھے۔ راستے میں سیدین صاحب دیہاتی اسکول دیکھتے ہوئے، کشمیری مہمان داری کا لطف اٹھاتے ہوئے ولر جھیل پہنچے۔ یہ سیر یادگار رہے گی۔ ایک پہاڑی پر بھابی جان نے اپنا اسٹو وجلانے کی کوشش کی کہ بھائی جان کو ہر خوبصورت جگہ چائے کی خواہش ہونے لگتی تھی مگر جھیل کے اطراف سے آنے والی تند و تیز ہواؤں نے اسٹو کو جلنے نہ دیا اور ہم سب چائے سے محروم رہے۔ خواہش تھی کہ ولر میں کشتی کی سیر کریں گے مگر دوپہر کے بعد اس کی لہریں خطرناک ہو جاتی ہیں۔ کشتی والے یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوئے۔ ولر جھیل بہت وسیع ہے۔ واقعی اس میں سمندر کی سی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ ہم لوگ پہاڑیوں پر سے جھیل کا نظارہ کرتے رہے اور لطف اٹھاتے رہے۔ کئی میل پیدل تیز دھوپ میں چل کر ڈاک بنگلہ آئے اور کھانے وغیرہ کے بعد تیسرے پہر سری نگر روانہ

ہوئے۔ چند لوگ موٹر میں باقی سب بس میں۔ عابد صاحب اس بار بس میں بیٹھے۔ میں بھائی جان کے ساتھ تھی۔ ہم لوگ رات کے قریب پہنچ گئے مگر بس نہ اب آتی ہے نہ تب۔ راستہ کتنا خطرناک ہے یہ دیکھ ہی آئے تھے۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور مسافروں کا پتا نہ تھا۔ بھابی جان بہت وہمی تھیں اور سخت فکر مند۔ مگر میرے تو دم پر بنی ہوئی تھی۔ یہ اندیشہ سانپ کی طرح پھن اٹھا رہا تھا کہ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ دعائیں مانگتے مانگتے زبان تھک چکی تھی مگر آنکھ سے آنسو نہ نکالتی تھی۔ ساڑھے دس یا گیارہ بجے یہ لوگ خیر سے واپس آئے تو مجھ پر گریہ کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔ اس زمانے میں میری یہ حالت تھی کہ پریشانی دور ہونے کے بعد رونے کا زور ہوا کرتا تھا۔ اب عرصے سے اس پر قابو پا چکی ہوں۔

وادی لولاب کی سیر بھی بھائی جان کے دورے کے سلسلے میں کی۔ ریاست میں اسکولوں کو دیکھتے، کشمیری مہمان نوازی سے لطف اٹھاتے (جس میں بھائی جان اور میں اکثر بھوکے رہ جاتے تھے کہ کشمیری کھانا ہم سے کھایا نہ جاتا تھا، ہم لوگ وادی لولاب پہنچے۔ ہم اس لولاب کی تلاش میں آئے تھے جس کے لیے اقبال نے کہا ہے۔

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب۔ اے وادی لولاب

مگر یہاں وادی خشک پڑی تھی۔ چشموں میں نل سے بھی پتلی دھار کہیں کہیں نظر آتی تھی اور بس کہ اس سال بارش نہ ہوئی تھی۔ یوں تو کشمیری حسینائیں ہر جگہ نظر آتی ہیں مگر یہاں یہ حسن کچھ اور بھی بڑھا ہوا ہے۔ ایک بچی یہاں ایسی دیکھی جس کی موہنی صورت آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔ کوئی سات آٹھ برس کی بچی، میلا سا ڈھیلا پھرن پہنے اور ٹوپی میں چاندی یا گلٹ کے کشمیری چاند سورج اٹکائے، کانوں میں بالیوں کے گچھے لٹکائے ہماری کار کے پاس کھڑی ہو گئی اور بچے ”پوسہ“ ”پوسہ“ مانگ رہے تھے اور وہ خاموش کھڑی تھی۔ نہایت حسین کھلتا ہوا گیہواں رنگ سیاہ غزالی آنکھیں، آدھے چاند کا ساما تھا، کشمیری

سیب کے سے سرخ گال اور گلاب کی پنکھڑی کے سے ہونٹ۔ کیا پیارا چہرہ تھا۔ کتنی معصومیت اور ساتھ ہی وقار تھا اس حسین میں۔ اُسے دیکھ کر بے اختیار یہ جی چاہا کہ اسے گود میں اٹھا کر موٹر میں بیٹھ جاؤں اور اُسے اغوا کر لاؤں۔ کاش یہ میری بچی ہوتی۔ گڈری کے اس لال کی یاد آج تک آتی ہے۔

کہاں تک بیان کروں کہ کشمیر کے اس سات سال کے قیام میں میں نے کتنی سیر کی اور کیا کیا دیکھا۔ یوں تو بھائی جان کے آنے کے بعد بھی میں تین بار کشمیر گئی مگر سیر و سیاحت نہیں کی کہ نہ وہ دل رہا تھا نہ صحت۔ ہر جگہ ان کی کمی اس شدت سے محسوس ہوتی کہ دل الٹنے لگتا تھا۔ فطرت کے حسن سے اب بھی متاثر ہوتی ہوں۔ حسین نظارے اب بھی مسحور کر لیتے ہیں مگر بس دم بھر کے لیے۔ اب نہ وہ ولولہ ہے نہ وہ امنگ نہ شوق۔ دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا۔

پہاڑوں کے علاوہ میدانی علاقوں کی سیر بھی میں نے خوب خوب کی۔ دیہات اور گاونو نسبتاً کم دیکھے اور شہروں میں زیادہ گئی۔ پانی پت کے آس پاس کا علاقہ کرنال، انبالہ، حصار، رہتک، گوڑ گاؤں وغیرہ کئی بار جانا ہوا۔ پنجاب میں امرتسر، جالندھر، گوجرانوالہ، سیال کوٹ، لاہور، راولپنڈی وغیرہ تقسیم ہند سے پہلے ہی جا چکی تھی۔ پونا ایک بار تو چند دن کے لیے سیر کو گئی تھی۔ پھر ۱۹۴۷ء میں چار ماہ بھائی جان کے ساتھ وہاں رہنا ہوا۔ مغربی گھاٹ کی یہ ننھی ننھی پہاڑیاں ان پر بسا یہ شہر اور آس پاس کا سرسبز علاقہ دیکھنے کے قابل ہے۔ بمبئی تو بیسیوں بار گئی ہوں۔ میرے چھوٹے بھائی جان کو بمبئی بہت پسند تھا۔ کہا کرتے تھے۔ ”بمبئی شہر نہیں عادت ہے۔“ ان کی دلچسپی کی سب چیزیں اسی شہر میں تھیں۔ دوست، ریس کے میدان، کریکٹ کلب، خود ان کا گھر۔ مگر مجھے اس کی ”عادت“ کبھی نہ پڑی اگرچہ پیاروں کی خاطر اکثر جانا ہوتا تھا۔ شروع میں پورے بمبئی اور اس کے آس پاس کی سیریں بھی خوب کیں مگر چند دن سے زیادہ وہاں جی نہ لگتا تھا۔ وہاں کا شور و غل میری برداشت سے

باہر تھا۔ لیکن بمبئی کا سمندر، گیٹ وے آف انڈیا، جوہو، چوپاٹی، میرین ڈرائیو، ہینگنگ گارڈن مجھے بہت پسند ہیں اور سمندر میں ڈوبتے اور طلوع ہوتے (جی ہاں دونوں نظر آسکتے ہیں) سورج کا نظارہ، اوشا کی کرنوں سے چمکتے چھپروں کی کشتیوں کے بادبان جو دور بحر ہند میں مچھلیاں پکڑتے ہوتے، میری نظروں کو باندھ لیتے تھے جو ہو پر سمندر کا جوار بھاٹا، تاڑ کے درختوں میں سے جھانکتا پورا چاند اور سمندر پر جوار بھاٹے کا نظارہ، یہ سب میری دلچسپی کی چیزیں تھیں اور ہیں اور اب بمبئی میرے لیے بہت پیارا ہو گیا ہے کہ اس کی خاک میں، میرے جان سے پیارے بھائی اور میری دوست، دو بہنیں جو دوست اور بھانج بھی تھیں منہ چھپائے سو رہے ہیں۔ ان کی آرام گاہوں کی کشش اب بھی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔

بھوپال عابد صاحب کا وطن ثانی تھا۔ وہاں تین بار گئی اور صرف بھوپال ہی کی نہیں آس پاس کی سیر بھی کی۔ بھائی صاحب اور بہن اس کے مضافات میں رہتے تھے اور اسی وجہ سے اس کا بہترین اور خوبصورت علاقہ دیکھنے کا موقع ملا۔ وسط ہند کے پلیٹو پر بسی اس قدیم ریاست کا اپنا الگ جغرافیہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔ یہاں حکومت کئی پشتوں تک مسلمان بیگموں کے ہاتھ میں رہی اور انہوں نے نہ صرف اپنی ریاست میں نظم و ضبط، تعلیم اور روشن خیالی پھیلانے کی جدوجہد کی بلکہ سلطان جہاں بیگم نے پورے ہندوستان کی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی کوشش میں اہم رول ادا کیا۔ یہ شہر دو چھوٹی بڑی جھیلوں، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں، خوبصورت مساجد اور عمارات اور سانچی ٹوپ کی وجہ سے اپنا ایک الگ حسن و مقام رکھتا ہے۔

اگر بھوپال کے تال نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے ہیں تو اس کے محل ریاض منزل نے اُس کی اہمیت اور احترام بڑھا دیا ہے جس میں میرے دو محترم بزرگ فرزند سرسید راس مسعود اور ڈاکٹر محمد اقبال رہے تھے اور جہاں میرے بھائی جان نے اپنے

ان محترم دوستوں کی رفاقت کا لطف اٹھایا تھا۔

چند سال پہلے جب میں چوتھی بار بھوپال گئی تو تاج المساجد کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گئی اور سر عقیدت سے جھک گیا۔ اسی زمانے میں لڑکیوں کے کالج میں مجھے مدعو کیا گیا۔ یہ کالج ایک پرانے شاہی محل میں واقع ہے جو آدھا تال کے اوپر بنا ہوا ہے اور آدھا زمین پر۔ اس کے علاوہ لڑکیوں اور ان کی استانیوں کی عقیدت و محبت اور خلوص نے مجھے گرویدہ کر لیا۔ ایک بار سیفیہ کالج میں بھی مجھے اور عابد صاحب کو بڑی محبت سے مدعو اور گرم جوشی سے استقبال کیا گیا تھا۔ وہاں جو تقریر میں نے کی تھی بعض نکتہ نوازاں تک اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ایک بار میں اپنی جان ہار دوست صفیہ جاں نثار کے ہاں جا کر دو دن رہی تھی۔ اس وقت بھی وہاں کے کالج میں مجھے کہانی پڑھنے کے لیے بلایا گیا اور لڑکے لڑکیوں نے بڑی گرم جوشی اور خلوص سے میری پذیرائی کی تھی۔ بھوپال کی یاد کے ساتھ صفیہ کی یاد بھی وابستہ ہو گئی ہے۔

پہلی بار بھوپال سے واپسی پر آگرے کی سیر بھی کی تھی۔ علاوہ تاج کے قلعہ اور دوسری تاریخی اور مذہبی عمارات بھی دیکھیں۔ تاج کو دن میں بھی دیکھا اور چاندنی رات میں بھی۔ پہلی بار تاج کو دیکھ کر جو اثر ہوتا ہے، جس طرح انسان مسحور ہو جاتا ہے محبت اور عقیدت کا یہ شاہ کار جس طرح دل میں بس جاتا ہے اُسے محسوس کیا جاسکتا ہے بیان نہیں۔ اس کے بعد آگرے جا کر چار پانچ بار میں نے تاج کو دیکھا ہے۔ اس پر کندہ کلام پاک کی سورتیں پڑھی ہیں اور ان فن کاروں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جنہوں نے یہ کمال دکھایا ہے۔ تاج کی جالیوں کی نفاست اور باریکیوں پر سردھنا ہے، اس کے گنبد اور میناروں غرض ہر چیز کو دیکھا ہے اور سوچا ہے کہ انسان کی حسن کاری، نفاست اور محنت کا اس سے بڑھ کر شاہ کار شاید کوئی اور نہیں ہوگا۔ یہ عمارت نہیں ایک ٹوٹے ہوئے محبت بھرے جسم کی آرزو مجسم ہو گئی ہے۔ یہ عمارت نہیں

ہندوستان کے مزدوروں اور معماروں نے حسن کا مجسمہ تراشا ہے جس میں اپنے خون جگر اور ماتھے کے پسینے کی گرمی اور سرخی ملا کر اُسے جاوداں بنا دیا ہے۔ خدا نے انسان کو حسن شناسی، حسن تراشی، حسن پرستی کی جولازوال نعمتیں ودیعت کی ہیں ان پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اہل دل اور صاحبان کمال اُسے دیکھ کر انسان اور خدا دونوں پر ایمان لانے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی بے حس یہ کہہ کر تاج کی عظمت کم کرنا چاہے کہ۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

تو وہ صرف شہنشاہ کی محبت کا ہی نہیں ان ہزاروں فن کاروں کی عظمت کا بھی مذاق اڑاتا ہے جن کی کاوش نے حسن کا یہ مندر تعمیر کیا تھا۔

آگرے اور تاج کے ساتھ مجھے اجنتا اور ایلورا کی سیر یاد آگئی۔ میرے دل میں عرصے سے وہاں جانے کی تمنا تھی۔ عابد صاحب تو پہلے کئی بار جا چکے تھے مگر ایک سال میری خاطر پھر وہاں گئے۔ پہلے تو ہم نے اورنگ آباد ٹھہر کر اس تاریخی شہر کی تاریخی عمارتوں اور حیرت انگیز چیزوں کی سیر کی۔ ”بی بی کا روضہ“ چھوٹا سا تاج محل کہا جاسکتا ہے۔ حسینی صاحب آرٹسٹ ایک عرصہ تک جامعہ ملیہ میں رہ چکے تھے۔ وہ اورنگ آباد میں ملے اور ان کے ساتھ ہم اجنتا، ایلورا دیکھنے کے لیے گئے۔ پہلے اجنتا گئے۔ کار میں چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ گئے جس پہاڑی پر وہاں رسٹ ہاؤس واقع ہے اس کے آس پاس کا قدرتی منظر بہت ہی دلکش ہے۔ میں نے یہ بات محسوس کی کہ ہمارے ہندوستانی رُشی منیوں نے جہاں بھی عبادت گاہیں یا خانقاہیں بنوائیں تو سرسبز اور قدرتی حسن سے مالا مال علاقے چنے ہیں۔ دنیا کی سب لذتیں ترک کر دیتے تھے مگر حسن قدرت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیتیں ان میں غیر معمولی تھیں۔ میں نے اجنتا ایلورا کی سیر کے بعد ایک طویل مقالہ ”اجنتا کے گم نام امر فن کاروں کے نام“ لکھا تھا جو رسالہ آج کل نے شائع کیا تھا۔ یہاں ایک آدھ صفحے

میں اس کا ذکر کیسے کیا جاسکتا ہے۔ بس یہ کہوں گی کہ جس ہندوستانی نے قدیم ہندوستان کے آرٹ کے ان سچے سچے بے مثال نمونوں کو نہیں دیکھا وہ بہت بڑی دولت سے محروم رہا۔ پتھر میں ترشے اور دیواروں پر نقش صنم تراشی اور مصوری کے یہ شاہکار فن کاروں کی عقیدت اور محبت کو فن میں سمونے کا ایک نادر کارنامہ ہیں جن کی مثال شاید دنیا میں نہ مل سکے گی۔ ایک ایک تصویر زبان بے زبانی سے کتنی داستانیں دہراتی ہے۔ فن کاروں کی بے پایاں عقیدت، گہرے فن کارانہ شعور اور ان تھک محنت کے امتزاج ہی سے ایسا آرٹ وجود میں آسکتا ہے جو ہزاروں برس تک باقی رہے۔ ایلورا میں صنم تراشی اور محنت و عقیدت کا اس سے بڑھ کر کمال نظر آتا ہے۔ مذہبی اساطیر کو پتھر میں یوں تراشا گیا ہے کہ انسان منہ کھولے محو حیرت بنے بس دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ہزاروں برس پرانا مندر کیلاش دیکھیے انسانی ہاتھوں نے اپنی شردھا کو کلا کے روپ میں ڈھال دیا ہے اس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ وہ کلا ہے جسے صرف عشق جنم دے سکتا ہے!

حیدرآباد بھی ان مقامات میں سے ہے جن کو دیکھنے کی بچپن سے آرزو تھی کہ پانی پت میں ہمارے خاندان کی ایک شاخ کے کچھ افراد وہاں نوکر تھے۔ ان کی لڑکیوں نے وہاں اعلیٰ تعلیم پائی تھی، وہاں کا لباس پہنتی تھیں اور وہاں کے قصے سن کر پریوں کے دیس کا سا سماں بندھ جاتا تھا۔

میرے والد بھی ایک عرصے تک حیدرآباد میں رہے تھے۔ وہ گلبرگہ میں نج کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ بھائی جان اور بھابی جان بھی وہاں گئے تو انہوں نے بھی اس شہر کی اور وہاں کے لوگوں کی بہت تعریف کی۔ عابد صاحب تو بارہا جاچکے تھے مگر عرصے تک میری یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

کوئی بیس بائیس سال پہلے، ایک گرمی میں ہم نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ اور بھائی جان نے نواب مہدی نواز جنگ کو لکھا کہ میری بہن اور عابد صاحب وہاں آئیں

گے آپ ان کو اپنے ہاں ٹھہرائیے۔

دلی سے روانہ ہوئے۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ ایک عجیب بات ہوئی بہت سویرے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ جھانکا، گاڑی گلبرگہ کے اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ جتنی دیر گاڑی وہاں کھڑی رہی میں بڑی اپنائیت کے ساتھ اس اسٹیشن کو دیکھتی رہی۔ پاکستان بننے کے بعد جب پانی پت ہم سے چھوٹ چکا تھا، تو کشمیر، پٹیالہ اور انبالہ جاتے ہوئے ہر بار یہی واقعہ مجھے پانی پت کے اسٹیشن پر پیش آیا کہ اچانک تین یا چار بچے میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ کوئی چھٹی حس تھی جو مجھے جگا دیتی تھی اور میں اپنے پانی پت کے اسٹیشن پر اتر کر اس کی پیاری سر زمین پر قدم رکھ کر تپتے دل کو تسلی دے لیا کرتی تھی۔ بعد میں تو خیر کئی بار پنجاب وقف بورڈ کی میٹنگ میں آتے یا جاتے اور دوبار حالی مشاعرے میں یا کسی اور کام سے خود پانی پت گئی ہوں گھومی ہوں۔ پرانے گھروں، مقدس زیارت گاہوں اور مسماںقبروں پر جا کر آنسو بہائے ہیں۔ دل و دماغ کو سکون بھی ملا ہے اور احساس درد میں تیزی بھی آئی ہے۔

حیدرآباد میں ہمارے محترم میزبانوں نواب و بیگم مہدی نواز جنگ نے جس محبت اور خلوص سے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور جس اپنائیت کا احساس دلایا اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ ان کا گھر جتنی بار حیدرآباد یا احمدآباد کے ساتھ جا کر رہی ہوں، اپنا ہی گھر محسوس ہوا۔ اور اس سے بڑھ کر دنیا میں کسی گھر اور گھر والوں کی کیا تعریف کی جاسکتی ہے؟

مہدی بھائی کی بدولت میں نے حیدرآباد اور اس کے آس پاس کے سارے علاقے کی خوب سیر کی۔ اتنا ہی نہیں یہاں کی ہر طبقے کی زندگی، تقریبات، اور رہن سہن کو دیکھا۔ یہاں کے لوگوں کے خلوص اور ادب نوازی سے متاثر ہوئی۔

جتنی بار میں حیدرآباد گئی ہوں وہاں کے ادیبوں، ادب نوازوں، قدر شناسوں اور میرے قاریوں نے میری پذیرائی کی ہے۔ میرے اعزاز میں جلسے کیے ہیں۔ دعوتیں

کی ہیں، تقریریں کی ہیں۔ مجھ سے کہانیاں پڑھوائی اور تقریریں کرائی ہیں۔ صدارتیں کرائیں۔ اسکولوں کی طالبات اور ٹیچرز نے محبت اور خلوص سے بلایا ہے۔ مجالس عزا میں شرکت کی ہے۔ ایک بار تو ایک ہزار عورتوں کے مجمع میں امام حسین و حضرت زینب پر تقریر بھی کی تھی جس کو وہاں کی خواتین نے بے حد پسند کیا۔ لطف یہ کہ صاحب مجلس نے سوکا نوٹ بھی بعد میں مجھے بھیجا جس کو میں نے شکر یہ کے ساتھ واپس کر دیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کئی بار جا کر دیکھی۔ اس کی قدیم مرکزی عمارت اتنی خوبصورت شاندار نفیس ہے کہ بے اختیار میرے منہ سے نکلا کہ علم کا یہ مندر حیدرآباد کی سب سے خوبصورت چیز ہے۔ حیدرآباد کے آس پاس کے سارے ساگر دیکھے۔ گولکنڈہ کے قلعہ کو دوبار جا کر خوب گھوم پھر کر دیکھا اور مرعوب ہوئی۔ سالار جنگ میوزیم کی دوبارہ زیارت کی مگر تشنگی باقی رہی۔ ایک شخص نے ہزاروں نوواردات جن میں سے ہر ایک اپنے رنگ میں لاجواب ہے کس طرح جمع کر ڈالے یہ خود ایک حیرت ناک چیز ہے۔ وہاں کی مساجد اور امام باڑے بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ نوبت پہاڑ سے سارا شہر نظر آتا ہے۔ حیدرآباد میں بنجارہ ہلز پر یوں تو ہزاروں ایک سے ایک حسین و شاندار مکانات ہیں مگر مہدی نواز جنگ کا پتھروں سے تراشا گھر ان کے حسن ذوق کا نمونہ اور حیدرآباد شہر کے قدرتی حسن سے میل کھاتا ہوا ایک عجیب دلکش گھر ہے۔

حیدرآباد سے مجھے بڑی محبت ہے۔ ایسی کہ سوا دلی اور پانی پت کے کسی اور شہر سے یہ قربت حاصل نہیں ہوئی۔ مگر اپنے پیارے بھائی مہدی نواز جنگ کے بعد حیدرآباد ایسا لگتا ہے جیسے آگرہ بے تاج محل کے ہو جائے۔



مولانا الطاف حسین حالی

مرزا غالب کے اخلاق و عادات و خیالات

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا۔ اُس کو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لئے اُن کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط اُنہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں اُن کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُن کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ اُن کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر اُن کو کبھی ناگوار نہ گذرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، با ایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں ”جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوچھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبر سن

کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔ باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے لنگڑے لو لے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہو گئی تھی، اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسب معمول سات پارچہ خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹی کے چراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں۔ چراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ جو گردش روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب۔ جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہو گئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا کہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے، آپ مجھے فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوادیں۔ انہوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے، اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے، اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے

مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کھوٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُتار کر اُنھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا۔

جیسی مرزا کی طبیعت میں درا کی اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی۔ اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اُن کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا، ہمیشہ کرایے کی کتابیں منگوا لیتے تھے، اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی اُن کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جس کی سنداہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے اُن کے کلام پر اعتراض کئے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی بادمخالف لکھی تھی، اُن کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علیحدہ بھیجی تھیں۔

مرزا کی تقریر میں اُن کی تحریر اور اُن کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ اُن سے ملنے اور اُن کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے۔ مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی، اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔ ایک دفعہ جب رمضان گذر چکا تو قلعے میں گئے۔ پادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے، عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا، اور اُس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑا تھا، اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزرده ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس

وقت مرزا صاحب اسی کوٹھڑی میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ”ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا“ مرزا نے کہا ”قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھڑی تو ہے۔“

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی اُن کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی۔

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا، مگر خودداری اور حفظ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امرا و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پاکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ اُن کے مکان پر نہیں آتے تھے، وہ بھی کبھی اُن کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص اُن کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اُس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفیٰ خان مرحوم کے مکان پر آئے، میں بھی اُس وقت وہاں موجود تھا، نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا، مرزا نے کہا مجھ کو ان کا ایک آنا دینا تھا، اس لیے اول وہاں گیا تھا، وہاں سے یہاں آیا ہوں۔

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم۔ چرٹ میں سوار۔ مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ ”کہ آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں“ جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اُسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی، وہ ایک وقت بھی بغیر

گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے، یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انہوں نے کھجڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا۔ اخیر میں اُن کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرہ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا اُن کے لئے گھر میں سے آتا تھا۔ اس میں صرف پاؤسیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں، دوسرے میں لعاب یا شوربا، ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی، ایک اور پیالی میں دو تین پیسہ بھر دہی، اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا، برتن تو بہت سے تھے، مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا ”اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا۔“

فواکہ میں آم اُن کو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں اُن کے دوست دُور دُور سے اُن کے لئے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے، اور وہ خود اپنے بعض دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگواتے تھے۔

ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے۔ باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدر ہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا ”مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ”پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے“

برسر ہردانہ بنوشتہ عیاں۔ کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے اُن کو آم نہیں بھاتے تھے۔

ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفہ بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اُس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا نے کہا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں۔ میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انہوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اُس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی، اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے، اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔



مشاق احمد یوسفی

مشاق احمد یوسفی نے اردو مزاح کو ایک نئے مزاج سے آشنا کیا ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یوسفی کا مزاح شگفتہ و شاداب ہے۔ شستگی اس مزاح کا جوہر ہے۔ ان کا طرز بیان سرتاسر ادبیت، ذہانت اور برجستگی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ بات میں سے بات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مضامین میں تفکر و تفنن کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ ان کے یہاں مشاہدے کی وسعت کا پتہ ان کی تحریر کے تیکھے پن سے چلتا ہے۔ وہ الفاظ کا مزاج پہچانتے ہیں اور لہجے کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہیں۔ اسی لئے اردو طنز و مزاح میں ایک نئی اور بھرپور آواز کا اضافہ ہوا ہے۔

مجنوں گورکھ پوری نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔ ”ادنیٰ سے ادنیٰ بات کے کسی نئے پہلو یا زاویے پر ہلکی سی روشنی ڈال کر اس کی طرف ہم کو متوجہ کر کے چونکا دینا اور خود متصوفانہ انداز میں آگے بڑھ جانا یوسفی کے فن کی وہ نزاکت ہے جو انہیں کے حصے میں آئی ہے۔ یوسفی کا قلم جس چیز کو بھی چھوتا ہے اس میں نئی روئیدگی اور تازہ بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ یوسفی ایک ظرافت نگار کی حیثیت سے ایک نیا دبستان ہیں۔“

”پڑیے گر بیمار“ ان کی شاہکار اور نمائندہ تحریر ہے۔

”خاکم بدہن“، ”زرگزشت“ اور ”چراغ تلے“ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔



پڑیے گر بیمار.....

تو کوئی نہ ہو تیار دار؟ جی نہیں! بھلا کوئی تیار دار نہ ہو تو بیمار پڑنے سے فائدہ؟ اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو؟ تو بہ کیجئے! مرنے کا یہ اکل کھرا دقیانوسی انداز مجھے کبھی پسند نہ آیا۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کے طرفدار یہ کہیں کہ مغرب کو محض جینے کا قرینہ آتا ہے، مرنے کا سلیقہ نہیں آتا اور سچ پوچھئے تو مرنے کا سلیقہ کچھ مشرق ہی کا حصہ ہے۔ اسی بنا پر غالب کی نفاست پسند طبیعت نے ۱۲۷ھ میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا کہ اس میں ان کی کسر شان تھی۔ حالانکہ اپنی پیشین گوئی کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے وہ اسی سال مرنے کے آرزو مند تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں باعزت طریقے سے مرنا ایک حادثہ نہیں، ہنر ہے، جس کے لئے عمر بھر ریاض کرنا پڑتا ہے۔ اور اللہ اگر توفیق نہ دے تو یہ ہر ایک کے بس کا روگ بھی نہیں۔ بالخصوص پیشہ ور سیاست دان اس کے فنی آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ بہت کم لیڈر ایسے گزرے ہیں جنہیں صحیح وقت پر مرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ہر لیڈر کی زندگی میں خواہ وہ کتنا ہی گیا گذرا کیوں نہ ہو ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ ذرا جی کڑا کر کے مرجائے یا اپنے سیاسی دشمنوں کو رشوت دے کر اپنے آپ کو شہید کرا لے تو وہ لوگ سال کے سال نہ سہی ہر الیکشن پر ضرور دھوم دھام سے ان کا عرس منایا کریں۔ البتہ وقت یہ ہے کہ اس قسم کی سعادت دوسرے کے زور بازو پر منحصر ہے۔ اور سعدی کہہ گئے ہیں کہ دوسرے کے بل بوتے پر جنت میں جانا عقوبتِ دوزخ کے برابر ہے۔ پھر اس کا کیا علاج کہ انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ورنہ سردست مجھے ان خوش نصیب جوان مرگوں سے سروکار نہیں جو جینے کے قرینے اور مرنے کے آداب سے واقف نہیں۔ میرا تعلق تو اس مظلوم اکثریت سے ہے جس کو بقول شاعر ع

جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

چنانچہ اس وقت میں اس بے زبان طبقہ کی ترجمانی کرنا چاہتا ہوں جو اس درمیانی کیفیت سے گزر رہا ہے۔ جو موت اور زندگی دونوں سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔ یعنی بیماری۔ میرا اشارہ اسی طبقہ کی طرف ہے جسے

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے صحت کے سوا

میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمہٴ علالت ہے۔ اسپرین کی صرف ایک گولی یا مارفیا کا ایک انجکشن اس سے نجات دلانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس روحانی اذیت کا کوئی علاج نہیں جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے۔ ایک دائم المرض کی حیثیت سے جو اس دردِ لوا کی لذت سے آشنا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مارفیا کے انجکشن مریض کے بجائے مزاج پرسی کرنے والوں کو لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آجائے۔

اردو شاعروں کے بیان کو باور کیا جائے تو پچھلے زمانے میں علالت کی غایت ”تقریب بہر ملاقات“ کے سوا کچھ نہ تھی۔ محبوب عیادت کے بہانے غیر کے گھر جاتا تھا اور ہر سمجھ دار آدمی اسی امید میں بیمار پڑتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مزاج پرسی کو آنکلیے۔

علالت بے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اس زمانے کے انداز عیادت میں کوئی دلنوازی ہو تو ہو میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو محض عیادت کے خوف سے تندرست رہنا چاہتے ہیں۔ ایک حساس دائم المرض کے لئے ”مزاج اچھا ہے“ ایک رسمی یا دعائیہ جملہ نہیں بلکہ ذاتی حملہ ہے جو ہر بار اسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں تو آئے دن کی پریش حال سے اس قدر بیزار ہو چکا ہوں کہ احباب کو آگاہ کر دیا ہے کہ جب تک میں بقلم خود یہ اطلاع نہ دوں کہ آج اچھا ہوں، مجھے حسب معمول بیمار ہی سمجھیں اور مزاج پرسی کر کے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دیں۔

سنا ہے کہ شائستہ آدمی کی یہ پہچان ہے کہ اگر آپ اس سے کہیں کہ مجھے فلاں بیماری ہے تو وہ کوئی آزمودہ دوا نہ بتائے۔ شائستگی کا یہ سخت معیار صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہمارے ملک میں

سوائے ڈاکٹروں کے کوئی اللہ کا بندہ شائستہ کہلانے کا مستحق نہ نکلے۔ یقین نہ آئے تو جھوٹ موٹ کسی سے یہ کہہ دیجئے کہ مجھے زکام ہو گیا ہے۔ پھر دیکھئے کیسے کیسے مجرب نسخے، خاندانی چٹکے اور فقیری ٹوٹکے آپ کو بتائے جاتے ہیں۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی اصل وجہ طبی معلومات کی زیادتی ہے یا مذاق سلیم کی کمی۔ بہر حال بیمار کو مشورہ دینا ہر تندرست آدمی اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فیصد لوگ ایک دوسرے کو مشورے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟

بعض اوقات احباب اس بات سے آزرده ہوتے ہیں کہ میں ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا حالانکہ ان پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو۔ اس وقت میرا منشا صلاح اور مشورہ کے نقصانات گنونا نہیں (اس لئے کہ میں دماغی صحت کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے، اس کا ذہنی توازن قائم رہتا ہے) نہ یہاں ستم ہائے عزیزاں کا شکوہ مقصود ہے۔ مدعا صرف اپنے ان بھی خواہوں کو متعارف کرانا ہے جو میرے مزمن امراض کے اسباب و علل پر غور کرتے اور اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً مجھے مستفید فرماتے رہتے ہیں۔ اگر اس غول میں آپ کو یہ جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں تو میری خستگی کی داد دینے کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ خود لائق ہمدردی ہیں۔

سرفہرست ان مزاج پرسی کرنے والوں کے نام ہیں جو مرض تشخیص کرتے ہیں نہ دوا تجویز کرتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منکسر مزاج ہیں۔ دراصل ان کا تعلق اس مدرسہ فکر سے ہے جس کے نزدیک پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ یہ اس شکم آزار عقیدے کے مبلغ کہ کھانا جتنا پھیکا سیٹھا ہوگا، صحت کے لئے اتنا ہی مفید ہوگا۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں دواؤں سے خواص دریافت کرنے کا بھی یہی معیار ہے۔ جس طرح بعض خوش اعتقاد لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ ہر بد صورت عورت نیک چلن ہوتی ہے اسی طرح طب قدیم میں ہر کڑوی چیز کو مصفی خون تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں انگریزی کھانے اور کڑوے

قدح اسی امید میں نوش جاں کئے جاتے ہیں۔

اس قبیل کے ہمدردانِ صحت دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک وہ غذا رسیدہ بزرگ جو اسے علاج کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو علاج اور کھانے دونوں سے پرہیز تجویز فرماتے ہیں۔ کچھلی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ میری بائیں آنکھ میں گوبانجی نکلی تو ایک نیم جان جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں، چھوٹے ہی بولے:

”معدہ پر ورم معلوم ہوتا ہے۔ دونوں وقت مونگ کی دال کھائیے۔ دافعِ نفخ و محللِ ورم ہے۔“

میں نے پوچھا ”آخر آپ کو میری ذات سے کون سی تکلیف پہنچی جو یہ مشورہ دے رہے ہیں؟“

فرمایا ”کیا مطلب؟“

عرض کیا ”دو چار دن مونگ کی دال کھا لیتا ہوں تو اُردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشا تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس صورت میں خدا نخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی کے کیا کروں گا؟“

بولے: ”آپ تجارت کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ترازو تھی۔“

گزارش کی ”اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی۔“

بات انہیں بہت بری لگی اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ سچ تھی۔ اس کے بعد تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ ہم نے ایک دوسرے کے لطیفوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ استعارہ اور کنایہ تو برطرف میرا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جب تک آدمی کو خواص کی غذا ملتی رہے اسے غذا کے خواص کے بکھیڑے میں پڑنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ سچ پوچھئے تو عمدہ غذا کے بعد کم از کم مجھے تو بڑا انشراح محسوس ہوتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کے ہر راہ گیر کو سینے سے لگا لوں۔

دوسرا گروہ قوتِ ارادی سے دوا اور غذا کا کام لینا چاہتا ہے اور جسمانی عوارض کے علاج معالجہ سے پہلے دماغ کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ حضرات ابتدائے مرض ہی سے دوا کے بجائے دعا کے قائل ہیں اور ان میں بھاری اکثریت ان سینئرے بیہنترے بزرگوں کی ہے جو گھگھیا گھگھیا کر اپنی درازی عمر کی دعا مانگتے ہیں اور اس کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔

اس روحانی غذا کے لئے میں فی الحال اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ مجھے اس پر قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہو جاتے ہیں۔

کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے اندازِ پرشش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے۔ وہ کسی آسمانی ہدایت کے بموجب اس تفتیش پر مامور کئے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوینزا کی وبا پھیلی اور میں بھی صاحبِ فراش ہو گیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے کمرہٴ علالت میں بہ نفسِ نفیس تشریف لائے اور خوب کرید کرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر راز دارانہ انداز میں کچھ ایسے نجی سوالات کئے جن کے پوچھنے کا حق میری نا چیز رائے میں بیوی اور منکر نکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔

ایک بزرگوار ہیں جن سے صرف دورانِ علالت میں ملاقات ہوتی ہے اس لئے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ موصوف آتے ہی برس پڑتے ہیں اور گرجتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتہ کا ذکر ہے۔ ہلہلا کر بخار چڑھ رہا تھا کہ وہ دھمکے۔ کپکپا کر کہنے لگے: ”بیماری آزاری میں بڑی غیریت برتتے ہو برخوردار! دو گھنٹے سے ملیریا میں چپ چاپ مبتلا ہو اور مجھے خبر تک نہ کی۔“

بہتیرا جی چاہا کہ اس دفعہ ان سے پوچھ ہی لوں کہ ”قبلہ کونین! اگر آپ کو بروقت اطلاع کر دیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے؟“

ان کی زبان قینچی کی طرح ہے جو چلتی زیادہ اور کاٹتی کم ہے۔ ڈانٹنے کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی کودن لڑکا زور زور سے پہاڑے یاد کر رہا ہو۔ مجھے ان کی ڈانٹ پر ذرا غصہ نہیں آتا۔ کیوں کہ اب اس کا مضمون ازبر ہو گیا ہے۔ یوں بھی اس کینڈے کے بزرگوں کی نصیحت میں

سے ڈانٹ اور داڑھی کو علیحدہ کر دیا جائے یا بصورتِ نقص امن ڈانٹ میں سے ڈنک نکال دیا جائے تو بقیہ بات (اگر کوئی چیز باقی رہتی ہے) نہایت لغوی معلوم ہوگی۔

ان کا آنا فرشتہ موت کا آنا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔ زکام انہیں نمونیہ کا پیش خیمہ دکھائی دیتا ہے اور خسرہ میں ٹائیفائیڈ کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ جہاں محض سیٹی سے کام چل سکتا ہے وہاں بے دھڑک بگل بجا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک ہی سانس میں خدا نخواستہ انا اللہ تک کی تمام منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ ان کی منظوم ڈانٹ کی تمہید کچھ اس قسم کی ہوتی ہے۔

”میاں! یہ بھی کوئی انداز ہے کہ گھر کے رئیسوں کی طرح ع

نبض پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

بیکاری بیماری کا گھر ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے ع

بیمار مباح کچھ کیا کر!“

مصراع کا جواب شعر سے دینا ہوگا۔

کمزور میری صحت بھی، کمزور میری بیماری بھی

اچھا جو ہوا کچھ کر نہ سکا، بیمار ہوا تو مر نہ سکا

یہ سن کر وہ پھر جاتے ہیں اور اپنے سن و سال کی آڑ لے کر کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان میں وہ بے نقط سناتے ہیں کہ زندہ تو درکنار مردہ بھی ایک دفعہ کفن پھاڑ کر سوال و جواب کے لئے اٹھ بیٹھے۔ تقریر کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ راقم الحروف جان بوجھ کر اپنی تندرستی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر خود کشی میرا منشا ہوتا تو یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ جیتا بلکہ آنکھ بند کر کے ان کی تجویز کردہ دوائیاں کھا لیتا۔

آئیے ایک اور مہربان سے آپ کو ملاؤں۔ ان کی تکنیک قدرے مختلف ہے۔ میرے صورت دیکھتے ہی ایسے ہراساں ہوتے ہیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کا معمول ہے کہ کمرے

میں بغیر کھٹکھٹائے داخل ہوتے ہیں اور میرے سلام کا جواب دیئے بغیر تیمارداروں کے پاس پنچوں کے بل جاتے ہیں۔ پھر کھسر پھسر ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی اچٹتا ہوا فقرہ مجھے بھی سنائی دے جاتا ہے۔

”صدقہ دیجئے۔ جمعرات کی رات بھاری ہوتی ہے۔“

”پانی حلق سے اتر جاتا ہے۔“

”آدمی پہچان لیتے ہیں۔“

یقین جانئے۔ یہ سن کر پانی سر سے گذر جاتا ہے۔ اور میں تو رہا ایک طرف خود تیماردار میری صورت نہیں پہچان سکتے۔

سرگوشیوں کے دوران ایک دفعہ میں نے خود دخل دے کر بقائمی ہوش و حواس عرض کرنا چاہا کہ میں بفضل تعالیٰ چاق و چوبند ہوں۔ صرف پیچیدہ دواؤں میں مبتلا ہوں۔ مگر اس مسئلہ کو قابل دست اندازی مریض نہیں سمجھتے اور اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے اعلان صحت اور ان کی پر زور تردید سے تیمارداروں کو میری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یوں بھی اگر بخار سوڈگری سے اوپر ہو جائے تو میں ہڈیاں بکنے لگتا ہوں جسے بیگم، اقبال گناہ اور رشتہ دار وصیت سمجھ کر ڈانٹتے ہیں اور بچے ڈانٹ سمجھ کر سہم جاتے ہیں۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ یہ حضرت مزاج پرسی کرنے آتے ہیں یا پر سادینے۔ ان کے جانے کے بعد میں واقعی محسوس کرتا ہوں کہ بس اب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ سانس لیتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ روایتی ہچکی نہ آجائے۔ ذرا گرمی لگتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ شاید آخری پسینہ ہے۔ اور طبیعت تھوڑی بحال ہوتی ہے تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں کہ کہیں سننجالا نہ ہو۔

لیکن مرزا عبدالودود بیگ کا انداز سب سے نرالا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں میری دلجوئی مقصود ہوتی ہے یا اس میں ان کے فلسفہ حیات و ممات کا دخل ہے بیماری کے فضائل ایسے دل نشین پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ صحت یاب ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ تندرستی وبال معلوم ہوتی ہے اور غسل صحت میں وہ تمام قباحتیں نظر آتی ہیں جن سے غالب کو فکر وصال میں دوچار ہونا پڑا۔

کہ گرنہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو۔

اکثر فرماتے ہیں کہ بیماری جان کا صدقہ ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ میرے حق میں تو یہ صدقہ جاریہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ خالی بیمار پڑنے سے کام نہیں چلتا اس لئے کہ پسماندہ ممالک میں ع

فیضانِ علالت عام سہی، عرفانِ علالت عام نہیں

ایک دن میں کان کے درد میں تڑپ رہا تھا کہ وہ آنکھ لے۔ اس افراتفری کے زمانے میں زندہ رہنے کے شداوند اور موت کے فیوض و برکات پر ایسی موثر تقریر کی کہ بے اختیار جی چاہا کہ انہیں کے قدموں پر پھڑ پھڑا کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دوں اور انشورنس کمپنی والوں کو روتا دھوتا چھوڑ جاؤں۔ ان کے دیکھے سب میرے تیمارداروں کی منہ کی رہی سہی رونق جاتی رہتی ہے مگر میں سچے دل سے ان کی عزت کرتا ہوں کیوں کہ میرا عقیدہ ہے کہ محض جینے کے لئے کسی فلسفہ کی ضرورت نہیں لیکن اپنے فلسفہ کی خاطر دوسروں کو جان دینے پر آمادہ کرنے کے لئے سلیقہ چاہئے۔

چونکہ یہ موقع ذاتی تاثرات کے اظہار کا نہیں اس لئے میں مرزا کے انداز عیادت کی طرف لوٹتا ہوں۔ وہ جب تندرستی کو ام النجائت اور تمام جرائم کی جڑ قرار دیتے ہیں تو مجھے رہ رہ کر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل ضرور پیش کرتے ہیں کہ جن ترقی یافتہ ممالک میں تندرستی کی وبا عام ہے وہاں جنسی جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ میں کان کے درد سے نڈھال ہونے لگا تو انہوں نے مسئلہ مسائل بیان کر کے میری ڈھارس بندھائی۔

”میاں ہمت سے کام لو۔ بڑے بڑے نبیوں پر یہ وقت پڑا ہے۔“

میں درد سے ہلکان ہو چکا تھا۔ ورنہ ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ خدا مارے یا چھوڑے میں بغیر دعویٰ نبوت یہ عذاب جھیلنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ علاوہ ازیں قصص الانبیاء میں نے بچپن میں پڑھی تھی اور یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ کون سے پیغمبر کان کے درد کے باوجود فرائض نبوی انجام دیتے رہے۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد میں نے ازراہِ تفسیر مرزا سے کہا ”فرینک ہیرس کے زمانے میں کوئی صاحب استطاعت مرد اس وقت تک ”جنٹلمین“ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ کم از کم ایک مرتبہ ناگفتہ بہ جنسی امراض میں مبتلا نہ ہوا ہو۔ یہ خیال عام تھا کہ اس سے شخصیت میں لوچ اور رچاؤ پیدا ہوتا ہے۔

تمباکو کے پان کا پہلا گھونٹ پی کر کہنے لگے ”خیر یہ تو ایک اخلاقی کمزوری کی فلسفیانہ تاویل ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ درد اخلاق کو سنوارتا ہے۔“

وہ ٹھہرے ایک جھکی۔ اس لئے میں نے فوراً یہ اقرار کر کے اپنا پنڈ چھڑایا کہ مجھے اس کلیہ سے اتفاق ہے۔ بشرطیکہ درد شدید ہو اور کسی دوسرے کے اٹھ رہا ہو۔“

پچھلے جاڑوں کا ذکر ہے، میں گرم پانی کی بوتل سے سینک رہا تھا کہ ایک بزرگ جو اسی سال کے پیٹے میں ہیں خیر و عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک خیر و عافیت کی باتیں کرتے رہے جو میرے تیمارداروں کو ذرا قبل از وقت معلوم ہوئیں۔ آتے ہی بہت سی دعائیں دیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ خدا مجھے ہزاری عمر دے تاکہ میں اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لئے زندہ رہوں۔ اس کے بعد جانکنی اور افتاد گور کا اس قدر مفصل حال بیان کیا کہ مجھے غریب خانے پر گورِ غریباں کا گمان ہونے لگا۔ عیادت میں عبادت کا ثواب لوٹ چکے تو میری جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا جس میں شفقت کم اور رعشہ زیادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی کو (جن کا انتقال تین ماہ قبل اسی مرض میں ہوا تھا جس میں مبتلا تھا) یاد کر کے کچھ اس طرح آبدیدہ ہوئے کہ میری بھی ہچکی بندہ گئی۔ میرے لئے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انہیں کچھ قرار آیا تو مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں ان غنچوں پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

میں فطرتاً رقیق القلب واقع ہوا ہوں اور طبیعت میں ایسی باتوں کی سہار بالکل نہیں ہے۔ ان کے جانے کے بعد جب لاد چلے گا بنجارہ والا موڈ طاری ہو جاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر پر چھائیں بھوت اور ہر سفید چیز فرشتہ دکھائی دیتی ہے۔ ذرا آنکھ لگتی ہے تو بے ربط خواب

دیکھنے لگتا ہوں گویا کوئی ”کامک“ یا با تصویر نفسیاتی افسانہ سامنے کھلا ہوا ہے۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر میری لاش پر انجکشن کی پچکاریوں سے لڑ رہے ہیں اور لہولہان ہو رہے ہیں۔ ادھر کچھ مریض اپنی اپنی نرس کو کلوروفارم سنگھار رہے ہیں۔ ذرا دور ایک لاعلاج مریض اپنے ڈاکٹر کو یسین حفظ کر رہا ہے۔ ہر طرف ساگودانے اور مونگ کی دال کی کھچڑی کے ڈھیر لگے ہیں۔ آسمان بنفشی ہو رہا ہے اور عناب کے درختوں کی چھاؤں میں سنا کی جھاڑیوں کی اوٹ لے کر بہت سے غلامان ایک مولوی کو غذا بالجبر کے طور پر معجونیں کھلا رہے ہیں۔ تاحد نظر کا فور میں بسے ہوئے کفن ہوا میں لہر رہے ہیں۔ جابجا لوبان سلگ رہا ہے اور میرا سر سنگ مرمر کی لوح مزار کے نیچے دبا ہوا ہے اور اس کی ٹھنڈک نس نس میں گھسی جا رہی ہے۔ میرے منہ میں سگریٹ اور ڈاکٹر کے منہ میں تھرما میٹر ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر پر برف کی تھیلی رکھی ہے، میرے منہ میں تھرما میٹر ٹھنسا ہوا ہے اور ڈاکٹر کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہے۔

لگے ہاتھوں عیادت کرنے والوں کی ایک اور قسم کا تعارف کرادوں۔ یہ حضرات جدید طریق کار برتتے اور نفسیات کا ہر اصول درو پر لگا دیتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد پوچھتے ہیں کہ افاقہ ہوا یا نہیں؟ گویا مریض سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ عالم نزع میں بھی ان کی معلومات عامہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے RUNNING COMMENTARY کرتا رہے گا۔ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح مریض پر ثابت کر دیں کہ وہ محض انتظاماً بیمار ہے یا وہم میں مبتلا ہے اور کسی سنگین غلط فہمی کی بنا پر اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ ان کی مثال اس روزہ خور کی سی ہے جو انتہائی نیک نیتی سے کسی روزہ دار کا روزہ لطیفوں سے بہلانا چاہتا ہو۔ مکالمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ملاقاتی : ماشاء اللہ آج منہ پر بڑی رونق ہے۔

مریض : جی ہاں آج شیو نہیں کیا ہے۔

ملاقاتی : آواز میں بھی کرارا پن ہے۔

مریض کی بیوی : ڈاکٹر نے صبح سے ساگودانہ بھی بند کر دیا ہے۔

ملاقاتی : (اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر) بیگما! یہ صحت یاب ہو جائیں تو ذرا انہیں میری پتھری دکھانا جو تم نے چار سال سے اسپرٹ کی بوتل میں رکھ چھوڑی ہے۔ (مریض سے مخاطب ہو کر) صاحب یوں تو ہر مریض کو اپنی آنکھ کا تزکا بھی شہتیر معلوم ہوتا ہے۔ مگر یقین چاہیے آپ کا شگاف بس دو تین انگل لمبا ہوگا میرا تو پورا ایک بالشت ہے۔ بالکل کنکھجورا معلوم ہوتا ہے۔

مریض : (کراہتے ہوئے) مگر میں تو ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوں۔

ملاقاتی : (ایکا ایکی پینترا بدل کر) یہ سب آپ کا وہم ہے۔ آپ کو صرف ملیریا ہے۔

مریض : یہ پاس والی چار پائی جواب خالی پڑی ہے اس کا مریض بھی اسی وہم میں مبتلا تھا

ملاقاتی : ارے صاحب مانئے تو! اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھویئے۔

مریض کی بیوی : (روہانسی ہو کر) دو دفعہ دھو چکے ہیں۔ صورت ہی ایسی ہے۔ اس وقت ایک

دیرینہ کرم فرمایا د آر ہے ہیں جن کا طرز عیادت ہی اور ہے۔ ایسا حلیہ بنا کر آتے

ہیں کہ خود ان کی ہی عیادت فرض ہو جاتی ہے ”مزاج شریف“ کو اور رسمی فقرہ نہیں

بلکہ سالانہ امتحان کا سوال سمجھتے ہیں اور سچ مچ اپنے مزاج کی جملہ تفصیلات

بتانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دن منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر میں نے ”مزاج

شریف“ کے بجائے ”سب خیریت ہے“ سے پرسش احوال کی۔ پلٹ کر بولے

”اس جہان عزلت میں خیریت کہاں؟“ اس مابعد الطبیعیاتی تمہید کے بعد کراچی

کے موسم کی خرابی کا بیان، آنکھوں میں آنسو بھرا ایسے انداز سے کیا گویا ان پر سراسر

ذاتی ظلم ہو رہا ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری میونسپل کارپوریشن پر عائد ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتیں شاعر کی نصیحت کے مطابق وقت کو پیمانہ امروز و فردا

سے نہیں ناپتیں بلکہ تاریخ و سنہ اور واقعات کی ترتیب کا حساب اپنی اولاد زچکیوں سے لگاتی

ہیں۔ مذکورہ صدر دوست بھی اپنی بیماریوں سے کیلنڈر کا کام لیتے ہیں۔ مثلاً شہزادی مارگریٹ کی

عمر وہ اپنے دے کے برابر بتاتے ہیں۔ سونز سے انگریزوں کے نہر بدر کئے جانے کی تاریخ وہی ہے جو ان کا پتا نکالے جانے کی۔ میرا قاعدہ یہ ہے کہ جب وہ اپنی اور جملہ متعلقین کی عدم خیریت کی تفصیلات بتا کر اٹھنے لگتے ہیں تو..... اپنی خیریت سے آگاہ کر دیتا ہوں۔

بیمار پڑنے کے صدہا نقصانات ہیں مگر ایک فائدہ بھی ہے، وہ یہ کہ اس بہانے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم ہو جاتی ہے۔ بہت سی کڑوی کسلی باتیں جو عام طور سے ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتی ہیں، بے شمار دل آزار فقرے جو ”خوف مناد خلق“ حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں یار لوگ نصیحت کی آڑ میں ”ہوالشانی“ بڑی بے تکلفی سے داغ دیتے ہیں۔ پچھلے سینچر کی بات ہے، میرے عقل داڑھ میں شدید درد تھا کہ ایک روٹھے ہوئے عزیز جن کے مکان پر حال ہی میں قرض کے روپے سے چھت پڑی تھی لقا کبوتر کی مانند سینہ تانے آئے اور فرمانے لگے۔

”ہیں آپ بھی ضدی آدمی۔ لاکھ سمجھایا کہ اپنا ذاتی مکان بنو لیجئے مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔“

طعن کی کاٹ درد کی شدت پر غالب آئی اور میں ڈرتے ڈرتے پوچھا ”بھائی! میری عقل تو اس وقت کام نہیں کرتی۔ خدا را آپ ہی بتائیے کیا یہ تکلیف صرف کرایہ داروں کو ہوتی ہے؟“ ہنس کر فرمایا ”بھلا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ کرائے کے مکان میں تندرستی کیوں کر ٹھیک رہ سکتی ہے؟“

کچھ دن بعد جب انہی حضرت نے میرے گھٹنے کے درد کو بے دودھ کی چائے پینے اور رمی کھیلنے کا شاخسانہ قرار دیا تو بے اختیار سر پینے کو جی چاہا۔

اب کچھ جگ بیتی بھی سن لیجئے۔ جھوٹ سچ کا حال خدا جانے۔ لیکن ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو ماہ قبل ان کے گلے میں خراش ہو گئی جو ان کے نزدیک بد مزہ کھانے اور گھر والوں کے خیال میں سگریٹ کی زیادتی کا نتیجہ تھی۔ شروع میں انہیں اپنی بیٹھی ہوئی آواز بہت بھلی معلوم ہوئی اور کیوں نہ ہوتی۔ سنتے چلے آئے ہیں کہ بیٹھی ہوئی HUSKY آواز میں

بے پناہ جنسی کشش ہوتی ہے۔ خدا کی دین ہے کہ گھر بیٹھے آواز بیٹھ گئی ورنہ امریکہ میں تو لوگ کوکا کولا کی طرح ڈالر بہاتے ہیں تب کہیں آواز میں یہ مستقل زکام کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لہذا جب ذرا افاقہ محسوس ہوا تو انہوں نے راتوں کو گڑ گڑا گڑا گڑا کر بلکہ خنخنا خنخنا کر دعائیں مانگیں:

”بارالہا تیری شانِ کریمی کے صدقے یہ سوزش بھلے ہی کم ہو جائے مگر بھرا ہوا گلا یونہی قائم رہے۔“

لیکن چند دن بعد جب ان کا گلا خالی بوتل کی طرح بھق بھق کرنے لگا تو انہیں بھی تشویش ہوئی۔ کسی نے کہا کہ لقمان کا قول ہے کہ ”پانی پیتے وقت ایک ہاتھ سے ناک بند کر لینے سے گلا کبھی خراب نہیں ہوتا۔“

ایک صاحب نے ارشاد فرمایا۔ سارا فتور پھل نہ کھانے کے سبب ہے۔ میں روزانہ نہار منہ پندرہ فٹ گنا کھاتا ہوں۔ معدہ اور دانت دونوں صاف رہتے ہیں۔“ اور ثبوت میں انہوں نے اپنے مصنوعی دانت دکھائے جو واقعی بہت صاف تھے۔

ایک اور خیر خواہ نے اطلاع دی کہ زکام ایک زہریلے وائرس (VIRUS) سے ہوتا ہے جو کسی دوا سے نہیں مرتا لہذا جو شانہ پیجئے کہ انسان کے علاوہ کوئی جاندار اس کا ذائقہ چکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بقیہ رواد انھیں کی زبانی سنئے۔

”اور جن کرم فرماؤں نے ازراہ کسرِ نفسی دوائیں تجویز نہیں کیں وہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے نام اور پتے بتا کر اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو گئے۔ کسی نے اصرار کیا کہ آیور ویدک علاج کراؤ۔ بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ میں طبعی موت مرنا چاہتا ہوں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ حکیم نباضِ ملت سے رجوع کیجئے۔ نبض پرانگی رکھتے ہی مریض کا شجرہ نسب بتا دیتے ہیں (اسی وجہ سے کراچی میں ان کی طبابت ٹھپ ہے) قارورے پر نظر ڈالتے ہی مریض کی آمدنی کا اندازہ لیتے ہیں اور زبان اگر ساتھ دیتی تو میں ضرور عرض کرتا کہ ایسے کام کے آدمی کو تو انکم ٹیکس کے محکمہ میں ہونا چاہئے۔“

غرض یہ کہ جتنے منہ ان سے کہیں زیادہ باتیں۔ اور تو اور سامنے کے فلیٹ میں رہنے والی اسٹینوگرافر (جو چست سویٹر اور جینز پہن کر بقول مرزا عبدالودود بیگ انگریزی کا S معلوم ہوتی ہے) بھی مزاج پرسی کو آئی اور کہنے لگی، حکیموں کے چکر میں نہ پڑیے۔ آنکھ بند کر کے ڈاکٹر دلاور کے پاس جائیے۔ تین مہینے ہوئے، آواز بنانے کی خاطر میں نے املی کھا کھا کر گلے کا ناس مار لیا تھا۔ میری خوش نصیبی کہے کہ ایک سہیلی نے ان کا پتہ بتا دیا، اب بہت افاقہ ہے۔

اس کے بیان کی تائید کچھ دن بعد مرزا عبدالودود بیگ نے بھی کی۔ انہوں نے تصدیق کی کہ ڈاکٹر صاحب امریکی طریقہ سے علاج کرتے ہیں اور ہر کسی کو بڑی توجہ سے دیکھتے ہیں چنانچہ سینڈل کے علاوہ ہر چیز اتروا کر انہوں نے اسٹینوگرافر کے حلق کا بغور معائنہ کیا۔ علاج سے واقعی کافی افاقہ ہوا اور وہ اس سلسلے میں ابھی تک پیٹھ پر بنفشی شعاعوں سے سینک کرانے جاتی ہے۔“

مجھے یقین ہے کہ اس طریقہ علاج سے ڈاکٹر موصوف کو کافی افاقہ ہوا ہوگا۔



قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر کے والد سید سجاد حیدر یلدرم اُردو کے مشہور ادیب اور والدہ نذر سجاد حیدر ناول و افسانہ نگار تھیں۔ وہ 20 جنوری 1920ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ انگریزی زبان میں ایم اے کیا۔ آپ کے والد ترکی میں ملازمت کرنے گئے تو یہ بھی ساتھ تھیں۔ کئی زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا۔ یورپ کا سفر بھی کیا۔ انگریزی میں بھی لکھتی تھیں۔ کالج چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد انگریزی اخباروں میں لکھنا شروع کیا۔ اردو میں چھوٹی عمر سے پھول اور نباتات میں لکھنا شروع کیا۔ آگے چل کر ساقی، ادب لطیف اور سویرا میں چھپتی رہیں۔

”میرے بھی صنم خانے“ قرۃ العین کا پہلا ناول ہے۔ انہوں نے شعور کی رو کے استعمال سے اپنے ناولوں میں نیا انداز پیدا کیا۔ ”آگ کا دریا“ ان کا مشہور اور مقبول ناول ہے۔ ناول کے ساتھ متعدد افسانے، ناولٹ، آپ بیتی تحریر کی۔ ستاروں سے آگے، پت جھڑکی آواز، شیشے کے گھر، روشنی کی رفتار ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں ”کارِ جہاں دراز ہے“ آپ بیتی ہے۔ ملک کے باوقار ”گیان پیٹھ ایوارڈ“ سے ان کے ادبی مرتبے کا اعتراف کیا گیا۔

ان کا مشاہدہ گہرا ہے، ان کے یہاں مغربی طرزِ فکر کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ذہنی فضا کی پیش کشی اور کرداروں کے نفسیاتی ردِ عمل کی تصویر کشی میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے کردار شعور کے سہارے ماضی کی بے کراں وسعتوں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ اجتماعی شعور کی بازیافت کرتی ہیں اور ہزاروں سال کی پھیلی ہوئی زندگی ان کے چند صفحات میں سمٹ آتی ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال ”یہ غازی یہ ترے پر اسرار بندے“ میں ملتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا انتقال اگست 2007ء میں دہلی میں ہوا۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے

قرۃ العین حیدر

ٹرین مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ حد نظر تک لالہ کے تختے لہلہا رہے تھے۔ دیہات کی شفاف سڑکوں پر سے کاریں زناٹے سے گزرتی جاتی تھیں۔ ندیوں میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں پانچ مسافر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھا جو کھڑکی سے سر نکائے باہر دیکھ رہا تھا، ایک فرہ عورت جو شاید اس کی بیٹی تھی اور اس کی طرف سے بہت فکر مند نظر آتی تھی۔ غالباً وہ بیمار تھا۔ سیٹ کے دوسرے سرے پر ایک خوش شکل طویل القامت شخص، چالیس سال کے لگ بھگ عمر متبسم پر سکون چہرہ، ایک فرنچ کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ مقابل کی کرسی پر ایک نوجوان لڑکی جو وضع قطع سے امریکن معلوم ہوتی تھی ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر سامنے والے پرکشش شخص کو دیکھ لیتی تھی۔ پانچویں مسافر کا چہرہ اخبار سے چھپا ہوا تھا۔ اخبار کسی اور اجنبی زبان میں تھا۔ شاید نارڈکجین یا ہنگیرین یا ہو سکتا ہے آئس لینڈک۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آئس لینڈک میں باتیں کرتے ہیں۔ پڑھتے لکھتے اور شعر کہتے ہیں۔ دنیا عجائب سے خالی نہیں۔

امریکن نما لڑکی نے جو خالص امریکن تجسس سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کون سی زبان ہے: اس خوبصورت آدمی کو اخبار پڑھنے والے نوجوان سے باتیں کرتے سنا۔ وہ بھی کسی اجنبی زبان میں بول رہا تھا لیکن وہ زبان ذرا مانوس سی معلوم ہوئی۔ لڑکی نے قیاس کیا کہ یہ شخص ایرانی ترک ہے۔ وہ اپنے شہر ٹورانٹو میں ایرانی طلباء سے مل چکی تھی۔ چلو یہ تو پتہ چل گیا کہ فیولس گائی (Fabulous guy) پرشین ہے۔ (اس نے انگریزی میں سوچا۔ میں آپ کو اردو

میں بتا رہی ہوں کیوں کہ افسانہ بزبان اردو ہے)

اچانک بوڑھے نے جو انگریز تھا آہستہ سے کہا

”دنیا واقعی خاصی خوبصورت ہے“

یہ ایک قطعی برطانوی انڈرا سٹیٹمنٹ تھا۔ لڑکی کو معلوم تھا کہ دنیا حد سے زیادہ خوبصورت ہے۔

بوڑھے کی بیٹی کینیڈین لڑکی کو دیکھ کر خفیف سی اداسی سے مسکرائی، باپ کی ٹانگوں پر کمر

پھیلا کر مادرانہ شفقت سے کہا۔ ”ڈیڈ! اب آرام کرو۔“

اس نے جواب دیا۔ ”انڈیا! میں یہ مناظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اس کے بعد بیٹی نے رساں سے کہا۔ ”اچھا۔ اس کے بعد ذرا سو جاؤ۔“

اس کے بعد وہ آکر کینیڈین لڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ گوانگریز تھی مگر شاید اپنا دکھ بانٹنا چاہتی تھی۔

”میرا نام ایڈنا ہنٹ ہے۔ یہ میرے والد ہیں پروفیسر چارلس ہنٹ۔“

اس نے آہستہ سے کہا۔

”تمارا فیلڈنگ۔ ٹورانٹو۔ کینیڈا“

”کیمبرج، انگلینڈ، ڈیڈ وہاں پیٹر ہاؤس میں ریاضی پڑھاتے تھے“

”سرطان۔ اور انھیں بتا دیا گیا ہے۔“ ایڈنا نے سرگوشی میں جواب دیا

”اوہ۔ آئی ایم سوسوری۔“ تمارا فیلڈنگ نے کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ کسی اجنبی کے ذاتی الم

میں دفعتاً داخل ہو جانے سے بڑی خجالت ہوتی ہے۔

”اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے۔“ ایڈنا نے آہستہ سے کہا۔ ”کہ یہ دنیا بہت جلد فلاں مدت

کے بعد اور ہمیشہ کے لئے چھوڑنی ہے تو جانے کیسا لگتا ہوگا۔“

”اس معاملے میں انسان کو بہت صابر اور فلسفی ہو جانا چاہئے“ تمارا نے کہا اور خفیف سی ہنسی۔

”حالانکہ یہ بھی بیکار ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جیسے میں اس وقت خود صابر اور فلسفی بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

تمارا نے کہا۔

ایڈنانے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ گو بحیثیت ایک وضعدار انگریز خاتون وہ کسی سے ذاتی سوال کرنا نہ چاہتی تھی۔

اس بے تکلف کینیڈین لڑکی نے بات جاری رکھی۔ ”میں جرمنی آنا چاہتی تھی۔ اس ملک سے بہت خوفناک یادیں وابستہ ہیں۔ میری والدہ کے دو ماموں، ایک خالہ، ان کے بچے سب کے سب۔ میری ممی آج بھی کسی فیکٹری کی چمنی سے دھواں نکلتا دیکھتی ہیں تو منہ پھیرتی ہیں“

”اوہ“

”حالانکہ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کے واقعات ہیں۔“

”اوہ۔ میں تمہارے کرسچین نام سے سمجھی تم روسی نژاد ہو۔ حالانکہ تمہارا خاندانی نام خالص اینگلو سیکسن ہے۔“

”میرے نانا روسی تھے۔ میرے والد کا اصل نام ڈیوڈ گرین برگ تھا۔ کینیڈا جا کر تعصب سے بچنے کے لئے بدل کر فیلڈنگ کر لیا لیکن میں۔“ اس نے ذرا جوش سے کہا ”میں اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں۔ میں اپنا پورا نام اس طرح لکھتی ہوں۔ تمہارا گرین برگ فیلڈنگ“

”واقعی۔“ برطانوی خاتون نے کہا ”کتنی دلچسپ بات ہے۔“

”اولاد آدم کا شجرہ بہت گنجلک ہے۔“ تمہارا نے غیر ارادی طور پر ذرا اونچی آواز میں کہا کیوں کہ وہ اس وجہ سے ہمیشہ متحیر رہتی تھی۔

سامنے والے دلکش آدمی نے اس کا فقرہ سنا اور سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ گویا کہتا ہو۔ ”میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔“ لڑکی دل ہی دل میں اس کی مشکور ہوئی اور اسے دیکھ کر خود مسکرائی۔ اب غالباً میں اس اجنبی پر عاشق ہوتی جا رہی ہوں۔

برطانوی خاتون نے بھی اندازہ لگایا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک جگہ پر دو انسان ایک دوسرے کی طرف کھینچیں تو سمجھ لیجئے کہ اس انڈر کرنٹ کو حاضرین فوراً محسوس کر لیں گے کیوں کہ اولاد آدم کی باہم کشش کا عجب گھپلا ہے۔

بوڑھا پروفیسر آنکھیں کھول کر پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

”میرے نانا..... جب کریمیا سے بھاگے انقلاب کے وقت تو اپنے ساتھ صرف قرآن

لے کر بھاگے تھے۔“ تمہارا نے آہستہ سے کہا

”کوران۔؟“ ایڈنا نے تعجب سے دہرایا۔

”ہاں۔ وہ موزلم تھے اور میری نانی، می کو بتاتی تھی، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لکھا

ہے، دنیا واقعی بہت خوبصورت ہے۔ اس میں خوشی سے رہو اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دو اور

شاید موزلم پروفٹ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر دنیا نہیں ہو سکتی۔“ سگریٹ سلگانے کے لئے تمہارا

نے حسب معمول لائٹر کی تلاش میں بیگ کھنگالنا شروع کیا۔ ایرانی نما شخص نے فوراً آگے جھک

کر اپنا لائٹر جلایا۔ پھر اجازت چاہ کر تمہارا کے پاس بیٹھ گیا۔

ایڈنا ہنٹ دوسری طرف سرک گئی، ایرانی نما شخص کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے سہانے منظر

دیکھنے میں محو ہو گیا۔ تمہارا نے اس سے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بزرگ سرطان میں مبتلا ہیں۔ جن

لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ چند روز بعد دنیا سے جانے والے ہیں انھیں جانے کیسا لگتا

ہوگا۔ یہ خیال کہ ہم بہت جلد معدوم ہو جائیں گے۔ یہ دنیا پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔“

ایرانی نما شخص درد مندی سے مسکرایا۔ ”جس انسان کو یہ معلوم ہو کہ وہ عنقریب موت کے

منہ میں جانے والا ہے، وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔“

”واقعی۔“

ہم سفر نے اپنا نام بتایا۔ دکتور شریفیان، بٹریز یونیورسٹی، شعبہ تاریخ کارڈ دیا۔ اس پر نام

کے بہت سے نیلے حروف چھپے تھے۔ لڑکی نے بشاشت سے دریافت کیا۔ ”این آئی کیو۔ یعنی

نو آئی۔ کیو؟“

”نصرت الدین امام قلی“

لڑکی نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس نصرت الدین امام قلی

سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات ہر گز نہیں ہے۔

ایک قصبے کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ اخبار پڑھنے والا لڑکا اسی جگہ سرعت سے اتر گیا۔ دکتور شریفیان بھی لپک کر باہر گئے۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ درخت، پھول اور گھاس پانی سے جگمگا رہے تھے۔ اکادکا مسافر برساتیاں اوڑھے پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحے بعد ایرانی پروفیسر لمبے ڈگ بھرتا کمپارٹمنٹ میں واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں لالہ کے دو گلدستے تھے جو اس نے بڑے اخلاق سے جھک کر دونوں خواتین کو پیش کئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹہ گزرا گیا۔ بوڑھا سوچکا تھا۔ دوسرے کونے میں اس کی فریبہ بیٹی اپنی بانہوں پر سر رکھ کر اونگھ رہی تھی۔ دفعتاً ایرانی دکتور نے کنیڈین لڑکی سے کہا۔ ”تمارا خانم کہاں تک میرے ساتھ رہو گی؟“

وہ اس سوال کا مطلب سمجھی اسے آج تک تمارا خانم کہہ کر مخاطب نہ کیا گیا تھا۔ دراصل وہ اپنے گھر اور کالج میں ٹم کہلاتی تھی۔ کہاں نامعقول ٹم! اور کہاں تمارا خانم۔ جیسے سرودنچ رہا ہو یا عمر خیام کا مصرع۔ تمارا خانم کی ایران سے واقفیت محض ایڈورڈ فٹز جیرلڈ تک محدود تھی۔ اس نے اسی کیفیت میں کہا۔ ”جہاں تک ممکن ہو۔“

بہر حال وہ دونوں ایک ہی جگہ جا رہے تھے۔ تمارا نے ایرانی پروفیسر کے سوٹ کیس پر چپکا لیبل پڑھ لیا تھا۔

”تم وہاں پڑھنے جا رہی ہو یا سیر کرنے؟“

”پڑھنے۔ بائو کمیسٹری۔ مجھے ایک اسکالرشپ ملا ہے۔ تم ظاہر ہے پڑھانے جا رہے ہو گے۔“

”صرف چند روز کے لئے۔ میری دانش گاہ نے ایک ضروری کام سے بھیجا ہے۔“ ٹرین قرون وسطی کے ایک خوابیدہ یونیورسٹی ٹاؤن میں داخل ہوئی۔

دوسرا روز وعدے کے مطابق ایک کیفے ٹیریا میں ملے۔ کاؤنٹر سے کھانا لینے کے بعد ایک

درتچے والی میز پر جا بیٹھے۔ درتچے کے عین نیچے خوش منظر ندی بہہ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر ایک کائی آلود گوتھک گر جا گھر کھڑا تھا۔ سیاہ گاؤن پہنے انڈر گریجویٹ ندی کے پل پر سے گزر رہے تھے۔

”بڑا خوبصورت شہر ہے۔“ تمارا نے بے ساختہ کیا۔ حالانکہ وہ جرمنی کی کسی چیز کی تعریف کرنا نہ چاہتی تھی۔

دکتر نصرت الدین ایک پر مذاق اور خوش دل شخص تھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے ہنساتا رہا۔ تمارا نے اسے بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ جرمنی سے کیوں متنفر تھی۔

اچانک نصرت الدین نے خالص طہرانی لہجے میں اس سے کہا۔
”خانم جون“

”ہوں؟ جون کا مطلب؟“

”زندگی؟“

”ونڈرفل یعنی میں تمہاری زندگی ہوں!“

اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔ ”ہاہا۔ میری زندگی! سنو خانم جون۔“

ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ تم مجھے بالکل میری دادی جیسی لگتی ہو؟“

”بہت خوب۔ آپ سے زیادہ بااخلاق شخص پورے یورپ میں نہ ہوگا۔“

ایک چوبیس سالہ لڑکی کو آپ دادی بنائے دے رہے ہیں۔“

”واللہ کسی روز تمہیں ان کی تصویر دکھاؤں گا۔“

دوسری شام وہ اس کے ہوٹل کے کمرے میں آیا۔ تمارا اب تک اپنا سوٹ کیس بند کر کے

سامان ترتیب سے نہیں جما سکی تھی۔ سارے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

”بہت پھوہڑ لڑکی ہو۔ کوئی سمجھ دار آدمی تم سے شادی نہ کرے گا۔“ اس نے آتش دان کے

سامنے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

تمارا نے جلدی جلدی کچھ سامان اٹھا کر ایک طرف رکھا۔
”لوگ باگ مجھ سے ابھی سے جلنے لگے ہیں کہ میں نے آتے ہی کیمپس کی سب سے
خوبصورت لڑکی چھانٹ لی۔“
”چھانٹ لی! عرب شیوخ کی طرح آپ بھی حرم رکھتے ہیں!“ تمارا نے مصنوعی غصے سے
کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ درتچے کے باہر صنوبر کے پتے سرسرائے۔
”وہ بھی عجیب عیاش، بزدل ظالم قوم ہے۔“ تمارا نے مزید اظہار خیال کیا اور ایک الماری
کا پٹ زور سے بند کر دیا۔ الماری کے قد آدم آئینے میں پروفیسر کا دلنواز پروفائل نظر آیا اور اس
پر مزید عاشق ہوئی۔

”تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ خانم جون ہم ایرانیوں کی بھی عربوں سے کبھی نہیں پٹی۔ ہم تو
انہیں کا کروچ کھانے والا کہتے ہیں۔“ نصرت نے مسکرا کر پائپ جلایا۔

”کا کروچ کھاتے ہیں؟“ تمارا نے حیرت سے پوچھا اور منہ بنایا۔ وحشی، بدو، مشرقی،
معاف کرنا میرا مطلب ہے۔ تم تو ان سے بہت مختلف ہو۔ ایرانی تو ڈل ایسٹ کے فرینچ مین
کہلاتے ہیں۔“ اس نے ذرا خجالت سے اضافہ کیا۔

”درستِ تشکر! تشکر!“

”ترجمہ کرو۔“

”جی تھینکس“ اس نے ناک میں بولنے والے امریکن لہجے میں کہا۔

وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ ”تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم سے کم ٹی۔وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔“

”واقعی؟ بہت جلد تم مجھے ٹی۔وی۔اسکرین پر دیکھ لوگی۔“

”کیا تم نے کبھی ایکٹنگ کی ہے؟“

”بہت۔ کالج میں ہمیشہ رومیو یہ خاکسار ہی بنا کرتا تھا اور فرہاڈ“

”فرہاد کون؟“

”تھے ایک صاحب۔ آغا فرہاد بیگ۔“ اس نے نظامی کے چند اشعار پڑھے۔ ان کا ترجمہ کیا۔ پھر پروفیسروں والے انداز میں جیسے کلاس کو پڑھاتا ہو، اس راستے کا نقشہ سمجھایا جدھر سے آرمینیا کی شہزادی شریں اس کے اپنے وطن آذربائیجان سے گزرتی ہوئی خسرو کے دارالسلطنت پہنچی تھی۔ بعد ازاں کوہ بے ستون کا جغرافیہ اس کینیڈین دانش جو کو ذہن نشیں کرایا۔ ہفتے کی شام کو وہ پہلی بار دکتور شریفیان کی قیام گاہ پر اس کے ہمراہ گئی کیمپس سے خاصی دور صنوبروں کے جھرمٹ میں چھپی ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل پر اس کا دو کمروں کا اپارٹمنٹ تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر نصیر الدین نے لیمپ جلایا۔ تمارا نے کوٹ اتار کر کرسی پر رکھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ فارسی کتابیں اور رسالے سارے میں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے۔

تمارا کو معلوم تھا اب وہ ہزاروں بار دہرایا ہوا ڈراما دہرایا جائے گا۔ وہ ریڈیو گرام پر ریکارڈ لگائے گا۔ پھر اس سے پوچھے گا اسے کونسی شراب پسند ہے۔ عین اس وقت سارے مغرب کے ان گنت کمروں میں یہی ڈراما کھیلا جا رہا ہوگا اور وہ اس ڈرامے میں اس آدمی کے ساتھ حصہ لیتے ہوئے ناخوش نہ تھی۔

نصرت نے قیمتی فرانسسیسی شراب اور دو گلاس سائڈ بورڈ سے نکالے اور صوفے کی طرف آیا۔ پھر اس نے جھک کر کہا۔ ”تمارا خانم اب وقت آ گیا ہے کہ تم کو اپنی دادی سے ملوؤں۔“

وہ سرخ ہو گئی ”معلوم ہے ہمارے یہاں مغرب میں اس جملے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟“

”معلوم ہے“ اس نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ لیکن اس کے لہجے کی خفیف سی بے پروائی کو تمارا نے شدت سے محسوس کیا۔ اب نصرت الدین نے الماری میں سے ایک چھوٹا سا البم نکالا اور ایک ورق الٹ کر اسے پیش کیا۔

ایک بے حد حسین لڑکی چھٹی صدی کے خاورمیانہ کی پوشاک میں ملبوس ایک فرنج وضع کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پس منظر میں سنگترے کے درخت تھے۔

”دادی اماں۔ اور یہ۔ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا“

تمارا نے دیکھا دادی میں اس سے بہت ہلکی سی مشابہت ضرور موجود تھی۔ اس نے دوسرا صفحہ پلٹنا چاہا۔ نصرت الدین نے فوراً بڑی ملائمت سے الہم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”تمارا خانم وقت ضائع نہ کرو۔ وقت بہت کم ہے“

تمارا نے سینڈل اتار کر پاؤں صوفے پر رکھ لئے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”اتنے نازک چھوٹے پیر۔ تم ضرور کسی شاہی خاندان سے ہو۔“

”ہوں تو سہی شاید۔“

”کون سا؟ ہر میجسٹی اعلیٰ حضرت تمہارے والد یا چچا دادا اس وقت سوئٹزر لینڈ کے کون سے قصبے میں پناہ گزین ہیں؟“

”میرے والد ٹورانٹو میں ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک ہیں۔ تمہارا نے نہیں دیکھا کہ ایک ہلکا سایہ دکتور شریفیان کے چہرے پر سے گزر گیا۔“ لیکن میرے نانا غالباً خواتین کریمیا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔“

”اوہو۔ خواتین کریمیا!..... حاجی سلیم گرائی۔ قرادولت گرائی۔ جانی بیگ گرائی محمود گرائی۔ کون سے گرائی؟“

”نصرت مجھے معلوم ہے تم تاریخ کے استاد ہو۔ رعب مت جھاڑو۔ مجھے پتہ نہیں کون سے گرائی۔ میں نے تو یہ نام اس وقت تم سے سنے ہیں۔“

”اور موصوف تمہارے نانا بابشویک انقلاب سے بھاگ کر پیرس آئے۔“

”ہاں، وہی پرانی کہانی۔ پیرس آئے اور ایک ریستوران میں نوکر ہو گئے اور ریستوران کے مالک کی خوبصورت لڑکی رزولین سے شادی کر لی اور رزولین کے ابا بہت خفا ہوئے کیوں کہ ان کی دوسری لڑکیوں نے یہاں جرمنی میں اپنے ہم مذہبوں سے بیاہ کئے تھے۔“ وہ دفعتاً چپ ہو گئی۔ اب اس کے چہرے پر سے ایک ہلکا سایہ گزرا جسے نصرت الدین امام قلی نے نہیں دیکھا۔

چند لمحوں بعد تمہارا نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”رزولین کے والد واقعی بہت خفا تھے۔ جب رزولین ان سے فخریہ کہتیں کہ انہوں نے ایک روسی شہزادے سے شادی کی ہے تو وہ گرج کر جواب دیتے۔ آج کل ہر چڑھتی کو چوان، سائیس، خاکروب، جو روس سے بھاگ کر یہاں آ رہا ہے، اپنے آپ کو ڈیوک اور کاڈنٹ سے کم نہیں بتاتا۔ تمہارا تاتاری خاوند بھی کریمیا کے کسی خان کا چوبدار رہا ہوگا، نانا بچارے کا تین سال بعد ہی انتقال ہو گیا۔ دراصل شاید جلاوطنی کا الم انہیں کھا گیا۔“ اب شریفیان کے چہرے پر سے ایک اور سایہ گزرا جیسے تمہارا نے نہیں دیکھا۔ ”میری ممی ان کی اکلوتی اولاد تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ممی نے ایک پولش ریفریو جی سے شادی کر لی۔ وہ دونوں آزاد فرانسیسی فوج میں اکٹھے لڑے تھے۔ جنگ کے بعد وہ فرانس سے ہجرت کر کے امریکہ آ گئے۔ جب میں پیدا ہوئی تو ممی نے میرا نام اپنی ایک نادیدہ مرحومہ پھوپھی کے نام پر تمہارا رکھا۔ وہ پھوپھی روسی خانہ جنگی میں ماری گئیں۔ ہمارے خاندان میں نصرت الدین ایسا لگتا ہے کہ ہر نسل نے دونوں طرف سوائے خوفناک قسم کے اموات کے کچھ نہیں دیکھا۔“

”ہاں بعض خاندان اور بعض نسلیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔“..... نصرت الدین نے آہستہ سے پوچھا۔ ”فی الحال تمہاری قومیت کیا ہے؟“

”کینیڈین“

ایرانی پروفیسر نے شراب گلاسوں میں انڈیلی اور مسکرا کر کہا۔ ”تمہارے نانا اور میری دادی کے نام۔“ انہوں نے گلاس ٹکرائے۔

دوسرا ہفتہ..... سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ریستوران کی طرف جاتے ہوئے بازار میں سے گزرے۔ اچانک وہ کھلونوں کی ایک دکان کے سامنے ٹھٹک گیا اور کھڑکیوں میں سچی گڑیوں کو بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔

”تمہارے بہت سارے بھانجے بھتیجے ہیں نصرت الدین؟“ تمہارا نے دریافت کیا۔

وہ اس کی طرف مڑا اور سادگی سے کہا۔ ”میرے پانچ عدد بچے اور ایک عدد ان کی ماں میری محبوب بیوی ہے۔ میری سب سے بڑی لڑکی اٹھارہ سال کی ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے اور اس کا منگیترا میرے بڑے بھائی کا لڑکا۔ وہ دراصل ٹسٹ پائلٹ ہے۔ بڑی خطرناک زندگی ہے اس بیچارے کی۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

اس وقت تمہارا کو معلوم ہوا کہ جب کسی پر فالج گرتا ہو تو کیسا لگتا ہوگا۔ اس نے آہستہ سے خود دار آواز میں جس سے ظاہر نہ ہو کہ شاک کی ہے۔ کہا ”تم نے کبھی بتایا نہیں۔“

”تم نے کبھی پوچھا نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اچانک تمہارا نے اسے پہلی بار دیکھا۔ وہ ایک سنگی انسان تھا۔ کوہ بے ستون کے پتھروں سے تراشا ہوا مجسمہ۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ تمہارا اس سے اسی طرح ملا کی۔ وہ اسے مغرب کی Permis Sive سوسائٹی کی ایک آوارہ لڑکی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ وہ تو اس پر سچے دل سے عاشق تھی۔ اس پر جان دیتی تھی۔

ایک رات ندی کے کنارے بیچ پر بیٹھے ہوئے نصرت نے تمہارا سے کہا
”ہلو خواند خاتون۔“

”کون؟“

”علا الدین کیقباد دوم کی ملکہ۔“

کبھی وہ اسے ترکان خاتون کہہ کہ پکارتا۔ ملک شاہ سلجوتی کی بیگم کبھی اسے ساقی بیگ کہتا۔ ”کیوں کہ تمہارے اندر کم از کم پندرہ فیصد تاتاری خون تو ہے ہی، اور سنو۔ فرض کرو۔“ ندی کے کنارے اس رات اس نے کہا ”اگر تمہارے نانا کریمیا ہی میں رہ گئے ہوتے وہیں کسی خانزادی سے شادی کر لی ہوتی اور تمہاری اماں فرض کرو ہمارے کسی اوغلو پاشا سے بیاہ کر تبریز آجاتیں تو تم میری گل چہر خانم ہو سکتی تھی۔“

دفعاً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تاریخ، نسل، خون، کس کا کیا قصور ہے؟ وہ بہت بے رحم تھا۔

نصرت الدین اس کے رونے سے مطلق نہ گھبرایا۔ نرمی سے کہا۔ ”چلو بی بی جون گھر چلیں۔“

”گھر؟“ اس نے سراٹھا کر کہا۔ ”میرا گھر کہاں ہے؟“

”تمہارا گھر ٹورانٹو میں ہے۔ تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے؟“ نصرت الدین نے ذرا تلخی سے کہا۔ وہ روتی رہی لیکن اچانک دل میں امید کی مدھم سی شمع روشن ہوئی۔ یہ ضرور اپنی بیوی سے ناخوش ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی پرسکون نہیں۔ اسی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ ”میرا گھر کہاں ہے؟“

ان تمام مغربی لڑکیوں کی طرح جو مشرقی نوجوانوں سے معاشقے کے دوران ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تمہارا بڑے اشتیاق سے فارسی کے چند فقرے یاد کرنے میں مصروف تھی۔ ایک روز کیفے ٹیریا میں اس نے کہا۔ ”آغا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں تب ملیں۔“

”ہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

”آج سے بیس سال بعد جب تم مورخوں کی کسی کانفرنس کی صدارت کے لئے مونٹریال آؤ یا یو۔ این۔ او میں ایرانی سفیر ہو کر نیویارک پہنچو۔“

”اور تم کسی امریکن کروڑ پتی کی فریبہ بیوہ ہو۔“

”ہاں۔ اور ٹفنی میں ہماری اچانک ڈبھیڑ ہو جائے۔ جہاں تم اپنی نواسی کی منگنی کی انگوٹھی خریدنے آئے ہو۔ اور تم سوچو میں نے اس بوڑھی موٹی عورت کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ فارسی میں بوڑھی عورت کو کیا کہتے ہیں؟“

”پیرہ زن۔“

”اور عربی میں؟“

”مجھے عربی نہیں آتی۔ ترکی اور فرنیچ میں البتہ بتا سکتا ہوں۔“

”سنو نصرت الدین۔ ایک بات سنو۔ آج صبح میں نے ایک عجیب خوفناک وعدہ اپنے آپ

سے کیا ہے“

”کیا؟“

”جب میں اس امریکن کروڑپتی سے شادی کروں گی؟“

”جو بوجہ السر تمہیں جلد بیوہ کر جائے گا۔“

”ہاں۔ لیکن اس سے قبل ایک بار۔ صرف ایک بار۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے۔ تبریز،

اصفہان، شیراز۔ میں وہاں پہنچ کر اپنے اس نامعقول شوہر کے ساتھ ضرور بے وفائی کروں گی۔

ضرور بالضرور۔“

نصرت نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”بعض دفعہ تم مجھے اپنی دادی کی تصویر

معلوم ہوتی ہو۔ بعض دفعہ میری لڑکی کی۔ وہ بھی تمہاری طرح اپنے ابن عم کو اس شدت سے

چاہتی ہے۔“ وہ پھر ملول نظر آیا۔

”آغا۔ تم مجھے بھی اپنی بنت عم سمجھو۔“

”تم میری بنت عم ہو تو سہی۔“

”کیوں کہ ہم سب اولاد آدم ہیں۔ ہے نا؟“

”اولاد آدم، اولاد ابراہیم، آل یافث، آل اسحق، آل اسمعیل، میں انسان کے شجرہ نسب

کے اس گھیلے پر مزید روشنی ڈال سکتا تھا تمہارا خانم لیکن اب کھانا شروع کرو۔“

وہ ریستوران کی دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اس کا پروفائل دیکھنے لگی اور بولی ”میں نے

آج تک ایسی خوبصورت ناک نہیں دیکھی۔“

”میں نے بھی نہیں دیکھی۔“ شریفیان نے کہا

”آغا۔ تم میں نرگیسیت بھی ہے؟“ تمہارا نے پوچھا۔
”ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

اس وقت اچانک تمہارا کو ایک قدیم فرانسیسی دعا یاد آئی جو برٹنی کے ماہی گیر سمندر میں اپنی
کشتی لے جانے سے پہلے پڑھتے تھے۔
اے ربِ عظیم۔ میری حفاظت کرنا
میری ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے
اور تیرا سمندر اتنا بڑا ہے
اس نے دل میں ڈہرایا
اے ربِ عظیم۔ اس کی حفاظت کرنا
اس کی ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے
اور تیرا سمندر
”آغا۔ ایک بات بتاؤ۔“
”ہوں۔“

”تم نے آج کا اخبار پڑھا؟ تمہارے ملک کے بہت دانش ور جو دانش ور شہنشاہ کے خلاف
ہیں انہوں نے برلن میں کل بڑا بھاری جلوس نکالا۔“
”پڑھا۔“
”تم تو جلاوطن ایرانی نہیں ہو؟“
”نہیں۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تمہارا خانم میں لڑکے پڑھاتا ہوں؟“
”اچھا شکر ہے۔ دیکھو کسی خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف آج کل دنیا میں خطرہ ہی خطرہ
ہے۔ اپنا خیال رکھو۔“
”اچھا۔“

اس رات وہ حسب معمول ندی کے کنارے بیٹھے تھے۔ تمارا نے کہا۔
”جب ہم اپنے اپنے دیس واپس جائیں گے میں کتنی باتیں یاد کروں گی۔ تم کو خیر کبھی میرا خیال بھی نہ آئے گا۔ تم مشرقی لوگوں کی عادت ہے یورپ امریکہ آکر لڑکیوں کے ساتھ تفریح کی اور واپس چلے گئے۔ بتاؤ کبھی میرا خیال آئے گا؟“
وہ مسکرا کر چپ چاپ پائپ پیتا رہا۔

”تم نصرت الدین امام قلی میرا دل رکھنے کے لئے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ کم از کم سال کے سال ایک عدد نیو ایریز کارڈ ہی بھیج دیا کرو گے۔ اب تک میرا پتہ بھی نوٹ بک میں نہیں لکھا۔ اس نے نصرت کے کوٹ کی جیب سے نوٹ بک نکالی۔ اس کا صفحہ پلٹ کر اپنا نام اور پتہ لکھا اور بولی۔ ”وعدہ کرو۔ یہاں سے جا کر مجھے خط لکھو گے۔“
”میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا خفگی سے آگے آگے چلنے لگی۔ نصرت نے چپکے سے جیب میں سے نوٹ بک نکالی۔ وہ صفحہ علیحدہ کیا جس پر تمارا نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ باریک باریک پرزے کر کے ان کی گولی بنائی اور ندی میں پھینک دی۔
صبح سویرے چھ بجے تمارا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تکیے سے ذرا سر اٹھا کر درتچے کے باہر دیکھا۔ صبح کی روشنی نقرئی پانی کی مانند صنوبروں پر پھیل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سو گئی۔

سوا آٹھ کے قریب جب وہ بستر سے اٹھی نصرت میز پر ناشتہ چننے میں مصروف ہو چکا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ تمارا نے کروٹ بدل کر کاہلی سے ہاتھ بڑھایا۔ ٹیلیفون پلنگ کے سہارے کتابوں کے انبار پر رکھا تھا۔ اس نے ذرا سا سرک کر رسیور اٹھایا اور ”الو“ کہے بغیر نصرت کو اشارے سے بلایا۔

وہ لپک کر آیا اور رسیور ہاتھ میں لے کر کسی سے فریج میں باتیں کرنے لگا۔ گفتگو ختم کرنے

کے بعد نصرت نے جھک کر اس سے کہا ”خانم جون۔ اب اٹھو“

اس نے سستی سے کلاک پر نظر ڈالی اور منٹ کی سوئی کو آہستہ آہستہ پھسلتے دیکھتی رہی۔ نصرت باورچی خانے میں گیا۔ قہوے کی کشتی لا کر گول میز پر رکھی۔ تمارا کو پھر آواز دی اور درتچے کے قریب کھڑے ہو کر قہوہ پینے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں توس تھا اور دوسرے میں پیالی اور وہ ذرا جلدی جلدی توس کھاتا جا رہا تھا۔ سفید جالی کے پردے کے مقابل اس کے پروفائل نے بے حد غضب ڈھایا تمارا چھلانگ لگا کر پلنگ سے اتری اور اس کے قریب جا کر بڑے لاڈ سے کہا۔ ”آج اتنی جلدی کیا ہے۔ تم تو ہمیشہ دیر سے کام پر جاتے ہو۔“

”ساڑھے نو بجے وائس چانسلر سے اپوائنٹ منٹ ہے۔ اس نے کلاک پر نظر ڈال کر جواب دیا۔“ جھٹ پٹ تیار ہونا شتہ کر لو۔ تمہیں راستہ میں اتارتا جاؤں گا۔“

ٹھیک نو بجے پر وہ دونوں عمارت کے باہر نکلے۔ صنوبروں کے جھنڈ میں سے گزرتے سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات بارش ہوئی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ گھاس میں کھلے زرد پھول کی وسعت میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

وہ دس منٹ تک سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے۔ اتنے میں ایک بس آتی نظر آئی۔ نصرت نے آنکھیں چندھیا کر اس کا نمبر پڑھا اور تمارا سے بولا۔ ”یہ تمہارے ہوٹل کی طرف نہیں جاتی۔ تم دوسری بس میں چلی جانا۔ میں اسے پکڑتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر بس روکی۔ تمارا کی طرف پلٹ کر کہا ”خدا حافظ“ اور لپک کر بس میں سوار ہو گیا۔

شام کو کلاس سے واپس آ کر تمارا نے حسب معمول اُسے فون کیا۔ گھنٹی بجی۔ وہ شاید اب تک واپس نہ آیا تھا۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ وہ کافی دیر میں سو کر اٹھی۔ اس کی جرمن روم میٹ باہر جا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر حسب معمول دروازے کے نیچے پڑے ہوئے سنڈے اڈیشن اٹھائے۔ سب سے

اوپر والے اخبار کی شہ سرخی میں وہ خوفناک خبر چھپی تھی۔ اس کی تصویر بھی شایع ہوئی تھی۔ وہ دکتور نصرت الدین امام قلی شریفیان پروفیسر تاریخ دانش گاہ تبریز نہیں تھا۔ ایرانی بھی نہیں تھا لیکن اخبار میں اس کا جو نام چھپا تھا وہ بھی غالباً اس کا اصل نام نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر اس دبلے پتلے نوجوان کی تھی جو ٹرین میں سارا وقت اخبار پڑھتا رہا تھا اور خاموشی سے ایک قصبے کے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔

نزدیک کے ایک شہر کے ایئر پورٹ میں ایک طیارے پر دستی بموں اور مشین گنوں سے حملہ کرتے ہوئے وہ تین مارے گئے تھے۔ نصرت الدین نے حملہ کرنے کے بعد سب سے پہلے دستی بم سے خود کو ہلاک کیا تھا۔ اپنی خوشی اپنی مرضی سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر نیم غشی کے عالم میں پڑی رہی۔ متواتر اور مسلسل اس کے دماغ میں طرح طرح کی تصویریں گھومتی رہیں۔ جیسے انسان کو سرسام یا ہائی بلڈ پریشر کے حملے کے دوران انوکھے نظارے دکھائی پڑتے ہیں۔ رنگ برنگے موتیوں کی جھالریں، سمندر، بے تکی شکلیں، آگ اور آوازیں۔ شاید وہ Clare audience کا شکار بھی بیٹھا باتیں کر رہا ہو اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ۔ میں نے تمہاری بات سنی تھی۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے، وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔ تم نے کبھی مجھ سے نہ پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے۔

ونڈر فل۔ میں تمہاری زندگی ہوں! ہا ہا میری زندگی۔ جان من۔ چلو وقت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ قربون۔ میری لڑکی کا منگیتر۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بیچارے کی۔ مجھے عربی نہیں آتی۔ بلوترکان خاتون۔ میں ایسے وعدے کبھی نہیں کرتا جو نبھانہ سکوں۔ تم میری بنتِ عم ہو تو سہی۔ آل اسحق۔ آل اسمعیل۔ میں بنی آدم کے شجرے کے اس گھیلے پر مزید روشنی ڈال سکتا ہوں۔ لیکن تمہارا خانم کھانا شروع کرو۔ دیکھو نصرت خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔ اچھا رکھوں گا۔ شہزادی ساتی بیگم۔

اندھیرا پڑے، پالا اس کی روم میٹ کمرے میں آئی۔ روشنی جلا کر تمارا کی طرف دیکھے بغیر بے دھیانی سے میکا کی انداز میں ہاتھ بڑھا کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کیا اور گنگناتی ہوئی بالکنی میں چلی گئی۔

تمارا نے کروٹ بدلی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بریلی ٹیلی اسکرین دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد نیوز ریل شروع ہوئی۔ اچانک اس کا کلوز اپ سامنے آیا۔ آدھا چہرہ آدھا دستی بم سے اڑچکا تھا۔ صرف پر وفائل باقی تھا دماغ بھی اڑچکا تھا۔ ایئر پورٹ کے چمکیلے شفاف فرش پر اس کا چہرہ بکھرا پڑا تھا اور انٹریاں۔ سیاہ جما ہوا خون۔ کٹا ہوا ہاتھ۔ کارتوس کی پٹی۔ گوشت اور ہڈیوں کا مختصر سا مل غوزہ تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم از کم ٹی۔ وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔ واقعی؟ جلد تم مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھ لوگی۔

کیرہ پیچھے ہٹا۔ لالہ کا ایک گلدستہ جو بھگدڑ میں کسی مسافر کے ہاتھ سے چھٹ کر گر گیا تھا۔ برابر میں نصرت الدین کا کٹا ہوا ہاتھ لالہ کے پھول اس کے خون میں لت پت۔ پھر اس کا آدھا چہرہ، پھر گوشت کامل غوزے کو اتنے قریب دیکھ کر تمارا کو ابکائی سی آئی۔ وہ چکرا کر اٹھی اور غسل خانے کی طرف بھاگنا چاہا۔ اس کی ہیبت زدہ چیخ سن کر پالا، اس کی روم میٹ بالکنی سے لپکی ہوئی آئی۔

تمارا نے دیکھا پالا کا چہرہ نیلا اور سفید تھا۔ پالا نے فوراً ٹیلی ویژن بند کیا اور اسے فرش پر سے اٹھانے کے لئے جھکی۔

پالا کے سر پر سفید اسکارف بندھا تھا جیسے نرس آپریشن ٹیبل پر سرطان کے مریض کو لٹاتی ہو۔ اسے ایک ٹرالی پر بٹھا کر گیس چیمبر کے اندر لے جایا جا رہا تھا اور برابر کی بھٹی میں انسان زندہ جلانے جا رہے تھے۔ ان کا سیاہ دھواں چمنیوں میں سے نکل کر آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتا جا رہا تھا۔

اب وہ ایک نیلے ہال میں تھی۔ دیواریں فرش، چھت برف کی طرح نیلی اور سرد۔ کمرے

کے بعد کمرے میں سفید آتشدان کے پاس ایک نیلے چہرہ والی عورت کھڑی تھی۔ شکل سے سنٹرل یورپین معلوم ہوتی تھی۔ پورا سراپا ایسا نیلا پروف جو ابھی پریس سے تیار ہو کر نہ نکلا ہو۔ ایک اور ہال۔ اس کے وسط میں قالین بافی کر گھا۔ کر گھے پر آدھا بنا ہوا قالین۔ اس پر ”شجر حیات“ کا ادھورا نمونہ۔

”یہ شجر حیات کیا چیز ہے نصرت الدین؟“

”مڈل ایسٹ کے قالینوں کا موتیف خانم جون۔“

کر گھے کی دوسری طرف سر پر رومال باندھے دو مڈل ایسٹرن عورتیں۔ پھر بہت سے پردے جیسے محلات میں ہوتے ہیں۔ اطلسی آبشار۔ وہ پردوں کے انبار میں الجھ گئی۔ پھر اس نے بگٹ بھاگنا شروع کیا مگر گیلری طویل ہوتی چلی گئی۔ وہ نیچے اتری۔ جیسے بنک کے تہ خانے ہوتے ہیں۔ چمکیلی سنگلاخ دیواریں، چمکیلا فرش یا جیل خانے کے اندر، سناٹا، اب وہ ایک بہت وسیع سرنگ میں چل رہی تھی۔ اچانک اسے چند کچڑ کے آدمی نظر آئے۔ وہ اس سرنگ یا انڈر گراؤنڈ ریلوے کے سنسان کوریڈور میں ایک مین ہول کے اندر اور اس کے گرد پھاوڑے لئے کھڑے تھے۔ کچڑ کے چہرے۔ کچڑ کی وردیاں انھیں دیکھ کر استہزاء سے ان سے وہ بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔ عین سامنے چوڑا دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر شہر کا بازار بارش ہو رہی تھی۔ ٹرامیں ٹن ٹن کرتی گزر رہی تھیں۔ دروازے کے برابر ایک پھول والی برسائی اوڑھے بیٹھی پھول بیچ رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر اس عورت کو چھوا، عورت مردہ تھی۔

اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ آگے بڑھی۔ سڑک پر مردوں کا ہجوم تھا، بسیں اور ٹرامیں مردے چلا رہے تھے۔ دکانوں میں خرید و فروخت مردے کر رہے تھے۔ ایک تھیٹر ہال میں جھانکا۔ اسٹیج پر ”سوان لیک“ میں مردے رقصاں تھے اور تماشائی بے جان تھے۔

”یہ زومی ہیں یا نامی؟“ اس نے ایک آدمی سے پوچھا جو تیز قدم رکھتا اس کے ساتھ

ساتھ چلنے لگا تھا۔

” قیس فتیں“ اس آدمی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔ ” زومی نہیں ماموزیل خالص۔ اصلی مُردے۔“

وہ آدمی بہت لمبا تھا۔ تاڑ کا تاڑ۔ گرے کوٹ میں ملبوس۔ مفلر سے سر چھپائے مستقل مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولتا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹریفک بتیوں کی مانند کبھی سُرخ ہو جاتیں کبھی سبز۔ اچانک اس نے تمارا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا پنچہ لوہے کا تھا۔ ”اِس کیوزمی“ تمارا نے نرمی سے کہا اور ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی ایک بس میں سوار ہو گئی۔

”یہ زندوں کا قبرستان ہے۔“ تمارا نے اپنے آپ کو بتایا۔ اب اُسے ساری باتیں آپ سے معلوم ہوتی جا رہی تھیں۔ میں چیزوں کو ان کے اصل بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔ اندر جا کر اس نے ایک ایئر کنڈیشنڈ قبر میں جھانکا۔ یہ ایک Split level قبر تھی۔ اندر رنگین ٹیلی ویژن کے سامنے زندہ لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ٹیلی ویژن پر سنٹرل یورپین نیلے چہرے والی عورت ”للی مارلین“ گا رہی تھی۔ اس نے ۱۹۱۶ء کے فیشن کا لباس پہن رکھا تھا۔ گڑ گڑاہٹ کے ساتھ خبریں شروع ہو گئیں۔ وہ خبریں سننا نہ چاہتی تھی اس لئے بھاگی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ جنازے قبرستان سے اُلٹے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ قبریں زندوں سے بھر گئی ہیں جگہ نہیں ملی۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا اور شہر واپس آئی۔ یہاں حسب معمول ہر جگہ مردے ہی مردے تھے۔ دفنوں میں، کارخانوں میں، ہر جگہ بعض مردوں نے کچھلی صدیوں کے لباس پہن رکھے تھے۔ اس کے سامنے ایک سوہویں صدی کا برطانوی بادشاہ اپنا تاج سیدھا کرتا ذرا جھینپا جھینپا کیوں کہ اس کا شاہی لباس بے حد شکن آلود اور بوسیدہ تھا۔ تابوت سے اٹھا اور جا کر نیجر کی کرسی پر گم سم بیٹھ گیا اور مٹی کے رنگ کی بھری بھری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

باہر پارک میں اٹھارہویں صدی کی مردہ عورتیں سائیکل چلانے کی مشق کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے مٹی کے تھے۔

”یہ ان لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جنرل لام بندی۔“ ایک گیارہویں صدی کے نارمن کسان نے جواب دیا اور سر

جھکائے پارک کی کیاری میں کدال چلاتا رہا۔ اس کے ہاتھ بالکل خشک اور سیاہ تھے۔

تب اس نے سوچا وقت دعا ہے۔ توبہ استغفار۔ توبہ استغفار۔ ایک عظیم الشان صومو فوراً

اس کے سامنے آگیا۔ وہ سر پر رومال باندھ کر اس کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ اندر

ربائی نمازِ عشاء پڑھنے میں مصروف تھا۔ دروازے کی محراب کے نیچے ایک آدمی گھٹنوں میں منہ

چھپائے بیٹھا سر پہ خاک ڈال رہا تھا۔

”معاف کیجئے گا آپ حضرت ایوب ہیں۔“ اس نے ادب سے جھک کر دریافت کیا۔

”نہیں میں بلبلہ کر خدا کو پکارتا ہوں مگر منہ سے صرف گالیاں نکلتی ہیں۔“ آدمی نے سراٹھا

کر جواب دیا

”آپ ابلیس ہیں؟“

”یا ابلیس، یا مجذوب یا محض نروس بریک ڈاؤن کا شکار۔“ اس نے جواب دیا اور مزید

راکھ سر پر ڈالی۔

”آپ نے ایل۔ ایس۔ ڈی بہت نوش جان کی ہوگی، آپ کی روح کو کیا تکلیف ہے۔“

”روح؟ روح گئی چولھے بھاڑ میں، کیسی روح؟“ اس نے جواب دیا اور بال نوچے۔

میں چیزوں کو ان کے بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔ اس نے دل میں دہرایا اور خود کو بہت

عاقل اور ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ ایک انڈر گراؤنڈ میں موجود تھی۔ ٹرین کبھی کبھی بھر جاتی

کبھی ایک دم خالی۔ اس میں دنیا بھر کی قوموں کے لوگ سوار تھے اور زمین کے نیچے نیچے آواز

سے زیادہ تیز رفتاری سے ساری دنیا میں گھوم رہی تھی۔ سرحدوں کے بعد سرحدیں۔

اور الجزائر

اور سنائی

اور سور یہ

اور

ٹرین سمندر کے نیچے سے نکل کر ایک تپتے ہوئے صحرا میں آگئی اور بغیر پٹریوں کے ریت پر چلنے لگی اور گڑ گڑاتی ہوئی سامنے پڑے سرخ رومن کھنڈروں میں گھس گئی۔

اور ٹائیر

اور صدون

اور نینوا

افتق پر سنسان خیموں کے پردے بادِ سموم میں پھٹ پٹھا رہے تھے۔ سارے میں جلی ہوئی رسیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچوں کی ننھی منی جوتیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت دور فرات بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نے بڑی کر بناک آواز میں پکارا العطش العطش۔ اس کے کیا معنی ہیں اس کی سمجھ میں نہ آیا کیوں کہ اسے کوئی زبان نہ آتی تھی سوا اپنی زبان کے۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔ میں وہاں ہو آئی ہوں، وہاں کچھ نہیں ہے، پر چھائیوں کی پرچھائیاں ہی ہیں۔

لیکن آواز برابر گونج رہی تھی۔ العطش۔

پھر ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی العطش۔

اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہوگئی۔ تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف اور بہت قریب نظر آرہی تھی۔

”آج خیمہ گاہوں پر پھر بمباری کی گئی ہے۔“ جرمن نیوز کاسٹرنے کہا۔

تیسرے روز جب اس کی طبیعت سنبھلی اور وہ کلاس کے بعد لنج کے لئے اسی کیفے ٹیریا میں گئی۔ درتچے کے سامنے والی میز پر اس وقت دو ہندوستانی طالب علم بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ان کے سامنے تازہ اخبار رکھا تھا جس میں ”نصرت الدین“ اور اس کے ساتھیوں کی مزید

تصویریں اور تفصیلات چھپی تھیں۔ تمہارا جلدی سے کاؤنٹر کے پاس جا کر قطار میں لگ گئی۔
بیاباں میں ہے۔

بیاباں میں ہے۔

دونوں طالب علم کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے اور ان کے جوش و خروش سے اندازہ
ہوتا تھا کہ شعر پڑھ رہے ہیں۔ (جیسے وہ فارسی اشعار اسے سنایا کرتا تھا)
آتش لینڈ کی طرح دنیا میں کتنی زبانیں ہیں جو تمہارا کو نہیں آتیں۔ کتنے جذبات تصورات،
نظریے، خواب، کرب اندوہ جن سے وہ واقف ہونا نہیں چاہتی۔ کافی کچھ جاننے کے باوجود
منتظر لالہ کب سے۔ کانٹا، چمچے اور پلیٹ اٹھا کر وہ قطار میں آگے سرکی۔

قہبا چاہئے۔ قہبا چاہئے

اس کو خون مرغوب ہے۔

سامنے سے تمہارا گرین برگ کو اپنی ٹرے اٹھائے آتا دیکھ کر وہ لڑکے معاً خاموش ہو گئے۔

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین 1932ء گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوئی۔ گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا چنانچہ مجتبیٰ صاحب نے علمی و ادبی مشاغل سے دلچسپی لی۔ مزاح نگاری کا آغاز اخبار ”سیاست“ کے شیشہ و تیشہ کالم سے ہوا۔ فطری مناسبت اور صلاحیت نے اس میں غیر معمولی کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں قیام پذیر رہے۔ بے شمار مضامین اور مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہیں۔ جن میں تکلف برطرف، قطع کلام، سو ہے وہ بھی آدمی، بالآخر وغیرہ چند اہم نام ہیں۔

”پدم شری“ کے اعزاز سے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ بین الاقوامی محافل میں آپ کو مدعو کیا جاتا ہے۔ وظیفہ پرسبکدوشی کے بعد سے حیدرآباد میں مقیم ہیں۔

مجتبیٰ حسین مزاح نگاروں میں انفرادی مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ کو زبان پر دسترس حاصل ہے۔ بات میں سے بات پیدا کرنے کا ہنر بڑی مہارت سے برتتے ہیں۔ آپ کی تحریر سادہ رواں اور شگفتہ ہوتی ہے۔

قدیم و جدید ادبی شخصیات کے دلچسپ خاکے لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ حسن چشتی نے آپ کے بے شمار مضامین اور خاکوں کا انتخاب دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اردو مزاح نگاری کی تاریخ مجتبیٰ حسین اور ان کی ادبی خدمات کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔



سلیمان اریب

میں جب بھی معظم جاہی مارکٹ پر واقع مجردگاہ کے کمرہ نمبر ۱ پر جاتا، اور اریب کے ہمراہ کسی ایسے شخص کو دیکھتا جو میرے لئے اجنبی ہوتا تو میں فوراً وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش شروع کر دیتا۔ کیوں کہ ایک اجنبی کی موجودگی میں اریب سے ملنا کم از کم میرے لئے بہت تکلیف دہ ہوا کرتا تھا۔ ایسی صورتوں میں وہ میرے پہنچتے ہی کہا کرتے ”اچھا ہوا تم آگئے۔ ان سے ملو۔ یہ فلاں صاحب ہیں لکھنو سے آئے ہیں۔ تم انہیں ذرا وہ لطیفہ تو سنادو۔“

میں انجان بن کر پوچھتا ”کون سا لطیفہ؟“

”ارے وہی لطیفہ جو تم نے میرے بارے میں گڑھا ہے۔ وہی میسٹری والا۔“ میں شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا، کیوں کہ اریب مجھے ہر بار مجبور کیا کرتے تھے کہ میں اس لطیفہ کو ہر نئے آنے والے شخص کے سامنے سناؤں، میں اُن کی بات کو ٹال جانے کی کوشش کرتا مگر وہ مسلسل اصرار کرتے کہ ”ارے بھئی! سنادو۔ یہ سننا چاہتے ہیں۔“

میں رونی صورت بنا کر لطیفہ سنانا شروع کر دیتا ”اچھا صاحب سنئے۔ لطیفہ صرف اتنا ہے کہ اریب اپنے مکان کی کمپاؤنڈ وال کو اونچا کرنا چاہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اس کا ذکر ایک میسٹری سے کر دیا۔ بد قسمتی سے یہ میسٹری سخن فہم ہونے کے علاوہ اریب کا مداح بھی تھا۔ گویا کر یلا وہ بھی نیم چڑھا۔ اب وہ ہر روز اریب کے گھر پہنچتا اور پوچھتا کہ کمپاؤنڈ وال کی تعمیر کا کام کب سے شروع ہونے والا ہے؟

اریب کہتے ”بھئی ابھی تو پیسوں کا بندوبست نہیں ہوا ہے۔ پیسہ آئے گا تو میں دیوار کی تعمیر کے لئے درکار مال خریدوں گا اور تمہیں اطلاع دوں گا۔“

اس کے باوجود میسٹری اریب کے مکان پر پہنچتا اور دیوار کی تعمیر کے لئے اُن سے

اصرار کرتا۔ اریب ہمیشہ یہی عذر کر کے اسے ٹال دیتے کہ ابھی پیسہ کا بندوبست نہیں ہوا ہے مگر وہ میسٹری کب ہار ماننے والا تھا۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ اینٹیں اور گارالے کر اریب کے گھر پہنچ گیا اور کہنے لگا۔

”اتفاق سے میرے پاس اینٹیں آگئی ہیں۔ آپ مجھے ان اینٹوں کی قیمت اس وقت ادا کیجئے جب آپ کے پاس پیسے آئیں۔ آپ کا بڑا مسئلہ تو حل ہو گیا ہے۔ اب آپ صرف مزدوروں کی اجرت ادا کرنے کا انتظام کیجئے۔ مال تو آ گیا ہے۔“

اس پر اریب نے کہا ”بھائی سچ بات تو یہ ہے کہ میں مزدوروں کی اجرت کا بندوبست بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا فی الحال اس مسئلہ کو ملتوی ہی رکھو۔“

اس پر میسٹری نے قدرے جھلا کر کہا ”آخر آپ پر ایسی کون سی آفت آن پڑی ہے کہ مزدوروں کی اجرت بھی ادا نہیں کر سکتے۔“

اریب مسکراتے ہوئے بولے ”بھائی اصل قصہ یہ ہے کہ ’صبا‘ ابھی تک پریس میں ہے۔ وہ چھپ جائے گا تو اشتہارات کی رقم ملے گی۔ اس سے پہلے میں پیسہ کہاں سے لاؤں گا؟“

تب میسٹری نے عاجز ہو کر کہا ”صاحب آپ سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ آج ہی سے ’صبا‘ کو میرے حوالے کر دیجئے۔ میں آئندہ سے ’صبا‘ بھی نکالوں گا اور آپ کی کمپاؤنڈ وال بھی تعمیر کر دوں گا۔“

لطیفہ ختم ہوتا تو اریب زوردار قہقہہ لگاتے اور فرط مسرت میں اجنبی سے یوں مصافحہ کرتے جیسے لطیفہ میں نے نہیں خود اریب نے سنایا ہو۔

میں انہیں کہتا ”اریب صاحب۔ لطیفہ تو آپ کو پسند آیا مگر اس نکتہ پر بھی غور کیجئے کہ لطیفہ کی رو سے ’صبا‘ ایک ایسا رسالہ بن جاتا ہے جسے نکالنے کے لئے ایک عدد سلیمان اریب کی نہیں بلکہ ایک میسٹری کی ضرورت پیش آتی ہے۔“ اس پر اریب پھر قہقہہ لگا کر اجنبی

سے مصافحہ کرتے۔ ابھی پہلے لطیفہ کی ہنسی ختم بھی نہیں ہوتی کہ اریب کہتے۔ ”اچھا وہ لطیفہ تو سناؤ۔“

میں پھر انجان بن کر پوچھتا ”کون سا لطیفہ؟“

”ارے وہی جامی صاحب والا۔“

میں اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر طوعاً و کرہاً لطیفہ سنانے لگتا۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایک بار کسی چھوٹی سے بات پر اریب صاحب اور جامی صاحب میں اُن بن ہو گئی۔ ایک دن جامی صاحب اور اینٹ ہوٹل میں بیٹھے اریب کا مذاق اڑا رہے تھے کہ میں نے پوچھا۔

”جامی صاحب! جب آپ اریب کو بڑا شاعر نہیں مانتے تو پھر آپ نے اپنے پہلے

مجموعہ کلام میں اریب کی رائے کیوں شائع کی ہے؟“

اس پر جامی صاحب نے اپنے تاریخی جھٹکے کے ساتھ کہا ”ہیں! تبھی تو اریب کی

رائے میں نے گرد پوش پر چھاپی ہے۔ بھلا گرد پوش بھی کبھی کتاب کا حصہ بن سکتا ہے؟“

اریب کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی اور وہ اپنے لمبے لمبے بال چہرے کے سامنے

پھینک کر ایک زوردار قہقہہ لگاتے اور پھر ایک بار اجنبی سے مصافحہ کرنے کا عمل دہرایا جاتا۔

میں اپنی جان چھڑا کر وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرتا مگر اسی اثناء میں اریب

پھر فرمائش کرتے ”اچھا اب وہ نوری والا لطیفہ تو سنا دو.....“

اب کی بار میرے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہو جاتے جیسے میں نے ارٹڈی کا تیل پی

لیا ہو۔ مگر میں جانتا تھا کہ لطیفہ سنائے بغیر اریب مجھے جانے نہیں دیں گے۔

میں پھر لطیفہ سنانا شروع کر دیتا اور اجنبی کی سہولت کے لئے کہنے لگتا ”اس لطیفے کو

سمجھنے کے لئے آپ کا شاہ نوری سے واقف ہونا ضروری ہے۔ شاہ نوری اریب کے اسٹنٹ

کے طور پر ”صبا“ کا کام کرتے تھے۔ ایک دن ایک صاحب اپنے چپراسی کے ذریعہ اریب کو

ایک خط بھیجنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے چپراسی کو بلا کر کہا۔ ”یہ خط لے کر کمرہ نمبر ۱۷ پر جاؤ

اور وہاں سلیمان اریب کو دے آؤ۔“ چہر اسی نے اریب کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے کہا ”اگر آپ اُن کا حلیہ بیان کر دیں تو مجھے پہچاننے میں آسانی ہوگی۔“ اُن صاحب نے کہا۔ ”ارے تم سلیمان اریب کو نہیں جانتے۔ لمبے لمبے بال رکھتے ہیں، اونچے پورے ہیں، گورا سا رنگ ہے.....“ چہر اسی نے پھر بھی اُنہیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔

تب ان صاحب نے کہا۔ ”ارے بھئی سلیمان اریب کو کون نہیں جانتا، مشہور شاعر ہیں، چہرے پر چچک کے داغ ہیں۔ کرتا اور پاجامہ پہنتے ہیں۔“

اس پر چہر اسی نے اچانک دماغ پر زور دیتے ہوئے پوچھا ”صاحب آپ کا اشارہ کہیں اُن صاحب کی طرف تو نہیں ہے جو اکثر شاہ نوری کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔“ اس پر اریب پھر ایک قہقہہ لگا کر کہتے ”لیجئے صاحب! یہ حیثیت ہوگئی ہے ہماری کہ لوگ شاہ نوری کے توسط سے ہمیں پہچاننے لگے ہیں جیسے ہماری کوئی حیثیت ہی نہ ہوئی۔“

میں یہ لطیفہ سنا کر کافی مطمئن ہو جاتا کیوں کہ اریب کے بارے میں میرے پاس صرف تین ہی لطیفے تھے۔ اریب اکثر پوچھتے ”تم نے میرے بارے میں صرف تین ہی لطیفے کیوں بنائے ہیں؟“

میں کہتا، اریب صاحب! سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کے بارے میں سینکڑوں لطیفے بنا سکتا ہوں، لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایک ہی لطیفہ کو سینکڑوں مرتبہ سناؤں۔ میں تو یہ تین لطیفے بنا کر ہی پچھتا رہا ہوں۔ جب بھی باہر سے کوئی مہمان آتا ہے یا کوئی ادبی شخصیت آتی ہے تو آپ اکبر اعظم بن جاتے ہیں اور میں صرف ملا دو پیازہ بن کر رہ جاتا ہوں۔ آخر میری بھی تو کوئی حیثیت ہے، اریب اس بات پر بھی مسکراتے۔

میں نے بہت سی زندہ دل شخصیتیں ایسی دیکھی ہیں جو اپنے بارے میں لطیفے سن کر ناک بھوں چڑھانے لگتی ہیں مگر اس معاملہ میں اریب کا حال جداگانہ تھا۔ وہ اپنے بارے میں ہونے والے مذاق کو عام کرنا چاہتے تھے بلکہ ایک نوبت تو وہ بھی آتی تھی جب لطیفہ گھڑنے والا

خود ایک لطیفہ بن جایا کرتا تھا۔

اریب کو سب سے پہلے میں نے ۱۹۵۲ء میں گلبرگہ میں دیکھا تھا۔ ہم لوگوں نے گلبرگہ میں ایک کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں اریب شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں اس مشاعرہ کا معتمد تھا۔ میری عمر یہی کوئی سترہ سال کی ہوگی۔ گویا یہ وہی عمر تھی جہاں سے آدمی اپنی زندگی میں لغزشوں کا آغاز کرتا ہے۔ اس عمر میں آدمی شعر کا مفہوم تو سمجھنے لگتا ہے لیکن شعر پر عمل کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہوتی۔ آدھی رات کا وقت تھا جب اریب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹرین سے گلبرگہ اسٹیشن پر اترے تھے۔ اریب اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے اور بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ یقین مانئے زندگی میں پہلی بار مجھے شاعروں کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا، میں نے احتیاطاً ایک آٹوگراف بک بھی خرید لی۔ میں چونکہ مشاعرہ کا معتمد تھا اسی لئے مجھے ڈرتھا کہ کہیں انتظامات کی گڑبڑ میں مجھے شاعروں کے آٹوگراف لینے کا موقع نہ مل سکے۔ اسی لئے اسٹیشن پر ہی میں نے اپنی آٹوگراف بک سب سے پہلے اریب کی جانب بڑھادی۔ انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا :

”رات کے دو بج رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے آٹوگراف لینے کا؟“

شاہد صدیقی نے ، جو برابر ہی کھڑے تھے، اچانک کہا ”اریب تم وقت نہ دیکھو بلکہ فوراً اپنے آٹوگراف دے دو۔ یہ لوگ کل تمہاری شاعری سن لیں گے تو شاید تم سے آٹوگراف لینے نہ آئیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مشاعرہ سے پہلے ہی آٹوگراف دے دو۔ تمہیں دوسروں کی غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔“

اریب نے کہا ”ایسی بات ہے تو پھر مجھے ابھی اپنے آٹوگراف دے دینا چاہئے۔“ یہ کہتے ہوئے اریب نے فوراً قلم نکالا اور آٹوگراف بک پر دستخط کر دیئے۔ مشاعرہ میں اریب نے بڑی جاندار نظم سنائی۔ مجھے اریب کی اس نظم کے کئی بند آج بھی یاد ہیں اور وہ آٹوگراف بک آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ پھر کئی برس بیت گئے۔ میں گلبرگہ سے حیدرآباد آ گیا اور

ادبی محفلوں میں اریب سے لگاتار اور مسلسل ملاقاتیں ہونے لگیں اور مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اریب ان لوگوں میں سے تھے جن سے آپ کا جی خواہ مخواہ ملنے کو چاہتا ہے۔ چنانچہ اریب کے اطراف بہت سے لوگ خواہ مخواہ جمع رہا کرتے تھے۔ میں نے جب بھی اریب کو دیکھا انہیں خواہ مخواہ لوگوں میں گھرا ہوا دیکھا۔ وہ خواہ مخواہ گھنٹوں دوستوں کے ساتھ بیٹھا کرتے اور خواہ مخواہ ان سے بحثیں کیا کرتے تھے۔ کمرہ نمبر ۱۷ ویسے تو ”صبا“ کا دفتر تھا مگر عملاً یہ اریب کے دوستوں کا اڈہ تھا۔ وہ صبح میں اس ارادے کے ساتھ اپنے گھر سے نکلتے تھے کہ دفتر میں بیٹھ کر کام کریں گے لیکن ”صبا“ کے دفتر پر پہنچتے تو دوستوں کے نرغے میں پھنس جاتے۔ دن بھر گپیں ہوتیں، چائے کے دور چلتے اور محفل کمرہ نمبر ۱۷ سے اٹھ کر سڑک پر جاری رہتی۔ اریب ہر روز اپنے ساتھ بیگ لے کر آتے، لیکن کبھی اس بیگ کو کھولنے کی نوبت نہ آتی۔ یہاں تک کہ ”صبا“ لیٹ ہو جاتا۔ خریداروں کے خطوط آنے لگتے، ایجنٹ یاد دہانی کرانے لگتے۔ لیکن اریب کی بے نیازی میں کوئی فرق نہ آتا۔ میں اریب سے کہا کرتا ”صبا“ اردو کا واحد ماہنامہ ہے جو سال میں چار مرتبہ بڑی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔“

اریب کے اطراف بھانت بھانت کے لوگ جمع رہتے تھے۔ ایسے لوگ بھی رہتے تھے جن سے کوئی شاعر یا ادیب چند منٹ کے لئے بھی بات نہیں کر سکتا مگر اریب ان سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ اریب کی ذات ایک ایسا گھاٹ تھی جس پر شیر اور بکری دونوں ایک ساتھ پانی پیا کرتے ہیں۔ حیدرآباد کا کوئی بھی مشاعرہ اریب کے بغیر نہ تو کامیاب ہو سکتا تھا اور نہ ہی فیل ہو سکتا تھا۔ بہت کم شعراء ایسے ہوں گے جن میں بیک وقت مشاعرہ کو کامیاب بنانے اور اسے فیل کرنے کی اتنی بڑی صلاحیت موجود ہو۔ اریب چاہتے تو مشاعرے کو بڑی بلندی تک لے جاتے اور کبھی بگڑ جاتے تو مشاعرہ کو بچہ کے کھلونے کی طرح توڑتا کر پھینک دیتے اور بڑی معصومیت کے ساتھ ٹوٹے ہوئے مشاعرے کی طرف دیکھتے۔ میں تو کہتا ہوں

کہ حیدرآباد کے مشاعروں کی آدھی فضاء اریب ہی بنایا کرتے تھے اور بقیہ آدھی دوسرے سارے شعراء مل کر بناتے تھے۔ شعر سنا کر سماں باندھنا تو سب کو آتا ہے لیکن اریب مشاعرہ میں صرف اپنی مخصوص آمد کے ذریعہ ہی سماں باندھ دیا کرتے تھے۔ مشاعرہ گاہ میں جب اریب داخل ہوتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے سچ مچ ایک شاعر چلا آ رہا ہے۔ بہکتی ہوئی چال، اطراف دوستوں کا ہجوم۔ یوں لگتا جیسے اریب کو پابہ زنجیر کر کے مشاعرہ میں لایا جا رہا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رک جاتے۔ سامعین پر پلٹ کر نگاہ ڈالتے۔ کوئی شناسا نظر آتا تو لہراتا ہوا سلام کر دیتے۔ اگر بہت زیادہ موڈ میں ہوتے تو سامعین کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے اپنے شناسا تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور ان کے احباب انہیں زبردستی روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ اریب اپنی مخصوص آمد کے ذریعہ ہی سامعین سے داد وصول کر لیا کرتے تھے۔ شعر سنا کر داد وصول کرنے کی نوبت بعد میں آتی۔ اریب کے انتقال پر مجھے سب سے زیادہ دکھ اس احساس سے ہوا کہ اب حیدرآباد میں کوئی ایسا شاعر باقی نہیں رہ گیا جو اریب کی سی شاعرانہ سچ دھج کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں داخل ہو سکے۔ اب شعراء مشاعرہ گاہ میں یوں پہنچتے ہیں جیسے کلام سنانے نہ آئے ہوں بلکہ کسی گھر میں نقب لگانے آئے ہوں۔ اریب اس دھوم دھام اور سچ دھج کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں آتے کہ یوں محسوس ہوتا جیسے مشاعرہ سے پہلے ہی انہوں نے مشاعرہ لوٹ لیا ہو۔ پھر کلام یوں سناتے جیسے وہ ڈانس پر نہیں دیوان خانہ میں بیٹھے ہوں۔ سامعین سے بے تکلف گفتگو ہوتی تھی۔ سامعین کے سوالات کے جوابات دیئے جاتے تھے۔ آخری زمانے میں تو وہ کلام کم سناتے تھے اور سامعین سے گفتگو زیادہ کرتے تھے۔ یوں تو اریب اپنی غزلیں اکثر ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ مگر میں ان سے کہا کرتا تھا کہ اریب صاحب آپ کا ترنم تو تحت اللفظ ترنم ہوا کرتا ہے۔ اس پر وہ کہتے ”بھئی شاعر اور قوال میں کچھ فرق تو ہونا ہی چاہئے۔“

صفیہ (مسز اریب) اریب صاحب کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی طاقت تھیں۔ ہر بات میں صفیہ کا بے موقعہ ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دن فراق کی شاعری پر

بحث ہو رہی تھی۔ کسی نے فراق کی شاعری کے بارے میں کہا کہ پروفیسر احتشام حسین کی یہ رائے ہے۔

اس پر اریب نے فوراً کہا ”اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔“ یہ کہہ کر وہ یوں مطمئن ہو گئے جیسے صفیہ کی رائے کے بعد اب پروفیسر احتشام حسین کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مسئلہ پیش ہوتا تو اریب اس میں صفیہ کی رائے کو ضرور شامل کر دیتے تھے۔ اُن کی بات چیت کا نمونہ کچھ اس طرح ہوتا تھا:

”عرب اسرائیل جنگ کے بارے میں امریکہ نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے صفیہ متفق نہیں ہے۔“ ”مسز اندرا گاندھی انقلابی اقدامات کے ذریعہ ملک میں سوشلزم لانا چاہتی ہیں اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔“ ”اُردو بڑی شیریں زبان ہے کیوں کہ صفیہ کی یہی رائے ہے۔“

ایک دن انہوں نے دوست احباب کی ایک محفل میں کوئی پندرہ سولہ مرتبہ صفیہ کی رائے کا ذکر کیا۔ محفل درخواست ہونے لگی تو اریب کے ایک بے تکلف دوست نے کسی بات پر اریب سے کہا ”اریب تم بڑے احمق اور بے وقوف آدمی ہو۔“ اس پر میں نے فوراً لقمہ دیا ”اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔“ اریب نے فوراً پلٹ کر مصافحہ کیا اور بڑی دیر تک ہنستے رہے۔

اریب کو اپنے اطراف نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو جمع کرنے کا بڑا خاص ملکہ تھا۔ اریب ہی نے انہیں سب سے پہلے ”صبا“ میں چھاپا۔ غالباً ۱۹۶۱ء میں میں نے موت کے موضوع پر چند کہانیاں لکھی تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا۔ ان کہانیوں کی اطلاع کسی طرح اریب تک پہنچ گئی۔ ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے ”سنا ہے کہ تم نے موت کے موضوع پر چند کہانیاں لکھی ہیں وہ کہانیاں پہلے ’صبا‘ کو دے دو۔“ میں نے کہا۔ ”اریب صاحب یہ کہانیاں بالکل رف حالت میں میرے پاس ہیں اور پھر

یہ اتنی طویل ہیں کہ انہیں اب فیر کرنا مجھ سے ممکن نہیں ہے۔“

اریب نے زبردستی مجھ سے ایک کہانی کا مسودہ لیا اور کہا تم فکر نہ کرو میں اسے فیر کر لوں گا۔ وہ کئی دن تک اس مسودہ کو فیر کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر میری ہینڈ رائٹنگ کچھ ایسی ہے کہ بعض اوقات مجھے بھی اپنی تحریر کو پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ لہذا اریب چند دنوں بعد میرے پاس آئے تو ان کے ساتھ میری کہانی کا مسودہ تھا اور اس کے ساتھ چند کاغذات بھی تھے جن پر اریب نے میری کہانی خود اپنے ہاتھ سے فیر کی تھی۔ کہنے لگے ”تمہاری ہینڈ رائٹنگ اتنی خراب ہے کہ بڑی مشکل سے چند صفحات ہی فیر کر سکا ہوں اور وہ بھی نامکمل۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟“

میں نے کہا ”اریب صاحب! میری ہینڈ رائٹنگ کو پڑھنے کے لئے آدمی کا بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔“

اریب نے کہا ”لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری جیسی ہینڈ رائٹنگ لکھنے کے لئے آدمی کا پڑھا لکھا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔“

پھر مجھے یہ ذمہ داری سونپی کہ میں اسے فیر کر کے دے دوں۔ اسی اثناء میں میں نے مزاح نگاری کے میدان کو اپنایا اور وہ کہانیاں جوں کی توں پڑی رہیں۔ جب بھی اریب ملتے یہ ضرور پوچھتے کہ میں نے ان کہانیوں کا کیا کیا۔

میں ان سے کہتا ”اریب صاحب، اب ان کہانیوں کو چھوڑیئے۔ میں نے مزاح لکھنا شروع کر دیا ہے، میں نے موت کے موضوع پر یہ کہانیاں لکھی تھیں اور اب چاہتا ہوں کہ یہ کہانیاں میری موت کے بعد ہی ’صبا‘ میں چھپیں۔“ اس پر اریب کہتے ”خیر ٹھیک ہے، میں تمہاری موت کا انتظار کر لوں گا۔ ابھی تو میں کافی جوان ہوں۔“

لیکن مزاح کے میدان میں بھی اریب نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ چنانچہ میرا پہلا مزاحیہ مضمون سب سے پہلے ۶۴ء میں ’صبا‘ میں چھپا۔

نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی میں وہ اس قدر آگے نکل جاتے تھے کہ بعد کو نوجوان ادیب خود اُن سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش کرنے لگ جاتے تھے۔ اریب کے ساتھ بے شمار بیٹھکیں ہوئیں۔ جب وہ ساری دنیا کو انگور کا پانی دینے کے موڈ میں ہوتے تو آپ اپنے کو یوں سمجھتے جیسے غالب کے بعد اگر اردو شاعری نے کوئی بڑا شاعر پیدا کیا ہے تو وہ خود ہیں۔ اس وقت وہ گردن اٹھا کر دنیا کی طرف یوں دیکھتے جیسے وہ ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھ گئے ہوں۔ اسی موڈ میں اریب کی اپنی ساتھیوں سے ان بن ہو جایا کرتی تھی۔ دوستوں سے خوب لڑتے جھگڑتے مگر دوسرے دن آتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں بلکہ دوستوں سے یہ تک نہ پوچھتے کہ انہوں نے رات میں کس کس سے کیا کہا تھا اور خود ہی اپنی باتوں پر ہنستے تھے۔

پھر اریب ایک دن اچانک بیمار ہو گئے۔ کسی نے بتایا کہ اُن کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ ان دنوں ادب میں ترسیل کے مسئلہ پر رسالوں میں بڑی بحث چل رہی تھی۔ ایک دن اریب سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ”اریب صاحب آپ تو سچ مچ ترسیل کا مسئلہ بن کر رہ گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب سے آپ کی آواز بیٹھ گئی ہے آپ کو ترسیل کا مسئلہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ رہا ہوگا۔“

اریب نے بیٹھی ہوئی آواز میں ہنسنے کی کوشش کی لیکن اُن کی آنکھوں نے بڑا زور دار قہقہہ لگایا۔ اریب کے ہونٹ کم مسکراتے تھے اور اُن کی آنکھیں زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر چند دنوں بعد ملے تو اُن کے گلے میں پلاسٹک کا ایک خول چڑھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

کہنے لگے صفیہ نے گلے میں پٹہ باندھ دیا ہے۔

میں نے کہا ”اریب صاحب! آپ تو ہمیشہ پٹے تڑاتے رہے ہیں۔ اس پٹے کی کیا

اہمیت ہے۔“

پھر کوئی نزاعی بات نکلی تو اریب پھر اٹھ کر برابر کی ٹیبل کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبیہ تلاش کرنے لگے۔ اسد اللہ اور میں انہیں روکتے رہے۔ مگر اس دن انہوں نے اس ”بار“ میں ایک بھی خالی ڈبیہ پڑی نہ رہنے دی۔ بات بات پر دستاویزی ثبوت تقسیم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے بیرے سے کہا کہ ”بار میں سگریٹ کی جتنی بھی خالی ڈبیاں پڑی ہوئی ہیں انہیں فوراً وہاں سے ہٹادو۔“ بیرے نے کہا ”اب میں کیا ہٹاؤں ساری ڈبیاں تو آپ کے ساتھی نے اٹھالی ہیں۔“

اس دن کے بعد میں نے اریب کو پھر کسی بار میں نہیں دیکھا۔ پھر وہ اسپتال میں داخل ہو گئے۔ موت آہستہ آہستہ اُن کی جانب بڑھنے لگی۔ اریب موت کے قدموں کی آہٹ سے بے نیاز جاتی ہوئی زندگی کے قدموں کی چاپ سنتے رہے۔ میں اکثر اُن سے ملنے اسپتال چلا جاتا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کو دیکھ کر میری آنکھ میں آنسو آ جاتے۔

غالباً ۲۸ اگست ۱۹۷۰ء کو میں، کرشن چندر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ مل کر اریب کو دیکھنے اسپتال گئے۔ اریب کے سیدھے ہاتھ پر زخم آ گیا تھا اور اسی دن اسپتال میں اس کا آپریشن ہوا تھا۔ اریب پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ بات کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ کرشن چندر کے قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ پھر سمندر کی ایک لہر کی طرح اریب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس وقت اریب بات نہیں کر سکتے تھے صرف مسکرا سکتے تھے۔ انہوں نے غالباً یہ محسوس کیا کہ ان کے بات نہ کرنے سے کرشن چندر خفا ہو جائیں گے۔ اسی لئے انہوں نے بات نہ کرنے کا دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کے لئے اپنے بائیں بازو سے کپڑا ہٹایا اور اپنا گہرا زخم دستاویزی ثبوت کے طور پر کرشن چندر کو دکھا دیا۔ کرشن چندر کی آنکھوں میں اچانک آنسو آ گئے مگر وہ ضبط کرتے رہے۔ کرشن چندر نے کہا۔ ”اریب یہ تمہیں کیا ہو گیا۔ ارے بھئی یہ تو ہمارے مرنے کے دن ہیں۔ تم ہم سے بھلا آگے کیسے جا سکتے ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کرشن چندر کا یہ جملہ سن کر اریب کی مسکراہٹ کے سمندر میں

ایک طوفان سا اٹھ گیا اور اس طوفان میں ہم سب بہہ گئے۔ اریب کے زخم کو وہ برداشت کر گئے تھے لیکن اریب کی مسکراہٹ کو برداشت کرنے کی اُن میں سکت نہیں تھی۔ وہ فوراً باہر نکل آئے اور دروازے کے سامنے ہی اچانک بیٹھ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور میں نے انہیں فوراً تھام لیا۔ اس وقت تو ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم اریب کو سنبھالتے۔ کیوں کہ اریب کمرہ کے اندر اکیلے رہ گئے تھے۔ لیکن مشکل تو یہی تھی کہ اریب کا کرب خود اریب تو بڑی آسانی سے سنبھال لیتے تھے لیکن ان کا کرب کوئی دوسرا آدمی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کرشن چندر کو برابر کے کمرہ میں لٹایا گیا اور فوراً ڈاکٹر کو طلب کیا گیا تاکہ وہ کرشن چندر کا معائنہ کر سکے۔

اب موت اریب کے بالکل قریب آگئی تھی۔ میں ہر روز صبح میں اخبار اٹھا کر سب سے پہلے اریب کی تصویر تلاش کرتا اور جب مجھے یہ تصویر نہ ملتی تو میں حیران سا رہ جاتا۔ اسی اثناء میں میرے مضامین کا دوسرا مجموعہ ”قطع کلام“ شائع ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اریب اس کتاب کو کبھی نہ پڑھ سکیں گے لیکن مجھے انہیں اپنی کتاب دینے کی بڑی جلدی تھی۔ ۶ ستمبر کی رات کو میں اپنی کتاب دینے کے لئے اریب کے پاس گیا۔ ان کی زندگی میں اب صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے بڑی نقاہت سے دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کتاب کے لئے شکر یہ ادا کیا۔ پھر اشارہ سے بتایا کہ وہ کچھ پڑھنے کے قابل نہیں ہیں۔ مجھے اشارہ کیا کہ میں کتاب کو کھولوں۔ میں نے کتاب کا پہلا ورق پلٹا۔ ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کیا لکھا ہے؟ میں نے زور سے کہا ”اریب صاحب! یہ میری کتاب کا ”پس و پیش لفظ“ ہے۔

سب لوگ ”پیش لفظ“ لکھتے ہیں مگر میں نے ”پس و پیش لفظ“ لکھا ہے۔“

یہ سنتے ہی اریب کے کمزور، نحیف اور خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ بڑی دور تک پھیل گئی اتنی دور تک کہ جب مسکراہٹ ختم ہوگئی تو اریب کو اپنے ہونٹ پھر اپنی جگہ پر لانے میں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ پھیلی ہوئی مسکراہٹ اب بھی کبھی واپس نہ

ہوگی جیسے یہ مسکراہٹ سمندر کی لہر بن کر ایک انجان سفر پر روانہ ہوگئی ہے۔ اریب کی یہ مسکراہٹ میرے دل میں ایک خنجر کی طرح اتر گئی۔ میں چپ چاپ اس خنجر کو اپنے دل میں چھپائے اور اریب کے ہونٹوں پر اپنی دی ہوئی مسکراہٹ کو جوں کا توں چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکل آیا۔ اور اس کے چند گھنٹوں بعد اریب اس دنیا سے چلے گئے۔

میں نے اریب کو غالباً اس دنیا کی آخری مسکراہٹ دی تھی اور یہ آخری مسکراہٹ ابھی تک میری آنکھوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اریب کے ہونٹوں سے یہ آخری مسکراہٹ چھین لوں اور اریب سے کہوں :

” اریب صاحب! میری دی ہوئی مسکراہٹ مجھے واپس کر دیجئے ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ میں آپ کو مسکراہٹ عطا کروں اور آپ میرے سینے میں خنجر اُتار دیں۔“ میں سچ مچ اریب سے یہ آخری مسکراہٹ چھین لینا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ اریب کی زندگی کی غالباً یہ پہلی اور آخری مسکراہٹ تھی جس میں اریب کی زندگی کا سارا درد اور سارا کرب سمٹ آیا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوا تھا جیسے اریب کے ہونٹوں سے ان کی آنکھیں ٹپا ٹپ ٹپکنے لگی ہیں اور زندگی قطرہ قطرہ بن کر خشک ہونے لگی ہے۔



عثمانیہ یونیورسٹی



مطالعہ ادب (حصہ اول)

مرتبہ شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد